قوانین اسلام

اسلام کا قانون بین الممالک

ڈاکٹر محمود احمد غازی

نائب رئیس الجامعہ الاسلامیة العالمیة اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد

اردو میں قانون کے اس شعبہ کیلئے جو قوموں اور ملکوں کے مابین تعلقات کو منظم کرتا ہے عموماً بین الاقوامی قانون کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جو انگریزی اصطلاح انٹرنیشنل لاء کا لفظی ترجمہ ہے۔ بعض اہل علم (مثلاً ڈاکٹر محمد حمید اللہ) نے قانون بین الممالک کی اصطلاح تجویز کی ہے، ان کا خیال ہے کہ قانون کا یہ شعبہ قوموں کے مابین تعلقات کو نہیں بلکہ ممالک کے مابین تعلقات کو منظم کرتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک زمانہ میں یورپ میں علاقائی وطنیت کے زیر اثر نیشن اسٹیٹ کا تصور بہت عام اور مقبول ہوا اسلئے ملک اور قوم دونوں اصطلاحیں عملاً مترادف بن کر رہ گئیں اور بین الاقوامی اور بین الممالک کا ایک ہی مفہوم ہو گیا۔ تاہم ان حضرات کا خیال ہے کہ چونکہ یہ قانون قوموں کے مسائل کے مقابلہ میں ملکوں کے تعلقات سے زیادہ بحث کرتا ہے اسلئے اس کیلئے موزوں تر نام قانون بین الممالک ہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں کچھ اور حضرات کی رائے میں اس قانون کا بنیادی موضوع اقوام ہیں اسلئے اس کا نام بین الاقوامی قانون ہی ہونا انسب ہے۔

لیکن فقہائے اسلام نے اس کے لئے نہ قانون بین الممالک کی اصطلاح اختیار کی اور نہ بین الاقوامی قانون کی، نہ ہی انہوں نے ان دونوں اصطلاحات سے مشابہ کوئی تیسری اصطلاح اختیار کی۔ انہوں نے اس شعبہ قانون کیلئے ایک اور منفرد اصطلاح اختیار کی جو بالواسطہ قرآن پاک سے اور بلا واسطہ احادیث رسول ﷺ سے ماخوذ ہے۔ فقہائے اسلام نے فقہ اسلامی کے اس شعبہ کیلئے سیر کی اصطلاح اختیار کی جو سیرت کی جمع ہے۔ سیرت کے لفظی معنی ہیں طرز عمل یا رویّہ یا زندگی کا اسلوب۔

اصطلاحی اعتبار سے سیر سے مراد ہے مسلمانوں کا وہ طرز عمل اور وہ رویہ جو اُن کو غیر مسلموں سے تعلقات، جنگ و صلح، دوسری ریاستوں سے میل جول اور دیگر بین الاقوامی یا بین الممالک اداروں اور افراد سے لین دین میں اپنانا چاہئے اسلامی قانون کا وہ شعبہ جو اس ساری سرگرمی کو منظم و منضبط کرتا ہے سیر کہلاتا ہے۔

سیر یعنی اسلامی بین الممالک قانون یا اسلام کا قانون بین الاقوام دنیا کی تاریخ کا قدیم ترین مرتب اور منضبط قانون ہے۔ جب مسلم فقہاء نے پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل سے ہی اسلامی قانون کے الگ الگ شعبوں پر غور کرنا شروع کیا

اوران سب شعبوں کے تفصیلی احکام مرتب ہونے لگے تو اسی وقت سے ان تمام شعبوں کو الگ الگ علوم کی حیثیت سے مرتب کرنے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کام پھیلتا رہا اور فقہ اسلامی کے مختلف اجزاء اور ابواب الگ الگ جداگانہ قوانین کی شکل میں سامنے آتے گئے چنانچہ ادب القاضی جو اسلام کا قانون ضابطہ یعنی پروسیجرل لاء (Procedural Law) ہے۔

دوسری صدی ہجری سے ہی ایک الگ اور منفرد شعبہ قانون کے طور پر معروف ومقبول ہے۔ اس پر دوسری صدی ہجری کے فقہاء نے الگ کتابیں لکھیں اور ایک جداگانہ تخصص کے طور پر اس کو دنیا کی تاریخ میں پہلی بار متعارف کرایا۔ اولیت کا یہ شرف علم سیر کو بھی حاصل ہے چنانچہ صدر اسلام کے فقہاء کرام نے پہلی صدی ہجری کے اواخر سے اس علم کو ایک جداگانہ، قانونی علم کے طور پر مرتب کرنا شروع کیا اور دوسری صدی ہجری کے وسط تک اس کو ایک باقاعدہ، جداگانہ مستقل بالذات اور ترقی یافتہ علم کی صورت دیدی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تیزی سے علم سیر بھی ترقی کرتا رہا، اس کو توسیع ملتی گئی اور اس کی ایک منفرد حیثیت، جداگانہ خصوصیات، مقاصد اور اہداف نمایاں ہوتے چلے گئے زیر نظر مقالہ میں علم سیر اور اسکے موضوعات ومندرجات کا جیسا کہ وہ اس علم کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک عمومی تعارف کرانا مقصود ہے۔ اس تعارف کے چار اجزاء ہوں گے۔

﴿1﴾ پہلا جزو علم سیر کے موضوعات، ان کی وسعت اور دائرہ کار سے متعلق ہوگا۔ یعنی علم سیر کے بنیادی اور اہم مباحث کون کون سے ہیں، یہ مباحث کب، کیوں اور کن حالات میں پیدا ہوئے اور فقہائے اسلام نے ان کو کیسے اور کن کن اعتبارات کے تحت مرتب کیا۔ پھر فقہائے کرام نے علم سیر کے بنیادی موضوعات کا تعین کرتے وقت کون کونسے سوالات اٹھائے اور ان سوالات اٹھانے سے کن مسائل ومعاملات کا حل کرنا مقصود تھا۔

﴿2﴾ دوسرا جزو علم سیر کے مصادر ومآخذ ہے جو بنیادی طور پر تو وہی ہیں جو فقہ اسلامی کے مصادر ومآخذ ہیں یعنی قرآن مجید، سنت رسول ﷺ، اجماع اور اجتہاد۔ لیکن بعض معاملات ایسے ہیں جن میں اسلام کے بین الاقوامی قانون میں فقہ کے عام مصادر ومآخذ سے ہٹ کر نئے مصادر ومآخذ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ یہ مختلف مصادر ومآخذ کیا ہیں اور قرآن وسنت میں ان کی سند کیا ہے۔

﴿3﴾ گفتگو کا تیسرا حصہ وہ خصوصیات وامتیازات ہیں جو اسلامی قانون بین الممالک کو دنیا کے دوسرے بین الاقوامی قوانین سے ممیز کرتے ہیں۔

﴿4﴾ گفتگو کا چوتھا حصہ ان مقاصد واہداف پر مشتمل ہوگا جو اسلام کا بین الاقوامی قانون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی ریاست ایک مقصدی ریاست ہے اور دوسری ریاستوں اور بین الاقوامی اداروں سے اسکے تعلقات بھی بلا مقصد نہیں ہو سکتے بامقصد ہی ہو سکتے ہیں، یہ مقاصد واہداف قریب قریب ہر دور میں اسلامی ریاستوں کے پیش نظر رہے ہیں۔ یہ مقاصد واہداف کیا ہیں اور قرآن وسنت میں ان کی کیا بنیاد ہے؟ آخر میں اس سوال کا مختصر جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس نقشہ کے مطابق گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل ضروری ہے کہ ایک ضروری تمہیدی گزارش پیش خدمت کی جائے۔ اور وہ یہ کہ دنیا کی

ہر قوم اور ہر نظام کے ماننے والوں کا یہ حق ہمیشہ تسلیم کیا گیا کہ جب وہ اپنے لئے بین الاقوامی تعلقات کا نظام تشکیل دیں یا بین الاقوامی لین دین کیلئے قواعد وضوابط مرتب کریں تو اس میں اپنے اور پرائے میں بہر حال فرق رکھتا ہے جو تعلقات اپنوں سے رکھے جاتے ہیں وہ پرایوں سے نہیں ہوتے۔ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ جو معاملہ وہ اپنے قریبی لوگوں سے کرتا ہے وہ معاملہ اجنبی لوگوں سے نہیں کرتا۔ یہ خاصہ بشریت ہے کہ وہ اپنے کو اپنا پرائے کو پرایا سمجھے اپنے کے ساتھ قربت اور مراعات کے روابط رکھنا اور پرائے سے نسبتاً اجنبیت برتنا بڑی حد تک انسان کیلئے فطری سی بات ہے اسلام نے بھی دین فطرت ہونے کی حیثیت سے بہت سے احکام میں اس چیز کا خیال رکھا ہے لیکن کس کو اپنا قرار دیا جائے اور کس کو پرایا سمجھا جائے؟ اسکا دارومدار قوموں کے اپنے تصور زندگی، نظریہ حیات، قومی مزاج، تہذیبی پس منظر اور اصول تمدن پر ہوتا ہے۔ دنیا کی بعض اقوام نسلی وحدت اور یک جہتی کو اپنے اور پرائے کی بنیاد قرار دیتی ہیں آج دنیا کی بہت سی با اثر اور بالادست اقوام ایک خاص نسل اور رنگ کے لوگوں کی حقیقی یا مصنوعی اور فرضی برتری کی بنیاد پر اپنے بین الاقوامی تعلقات کو استوار کرتی ہیں۔ آج بین الاقوامی تعلقات میں جس قوم کو ''موسٹ فیورٹ نیشن'' یعنی سب سے زیادہ مراعات اور توجہ کی مستحق قوم قرار دیا جاتا ہے اسکا بنیادی جذبہ اور محرک بھی اپنے اور پرائے کا فرق ہی ہوتا ہے۔ بعض دیگر اقوام رنگ کی بنیاد پر یہ امتیاز برتتی ہیں۔ ابھی ماضی قریب تک جنوبی افریقہ میں رنگ کے امتیاز کو باقاعدہ فلسفہ کی حیثیت حاصل تھی جسکی بنیاد پر سیاست، قانون، دستور، معاشیات، تعلیم حتی کہ صحت اور شہری سہولتوں تک ہر چیز کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ ہم میں سے بہت سے حضرات نے سنا ہے اور بعض نے دیکھا بھی ہے کہ کس طرح رنگ کے فرق کی بنیاد پر نسلی امتیاز کا یہ نظام بنایا گیا جو کئی سو سال جاری رہا۔ اس نظام میں انسانوں کی چار قسمیں قرار دی گئیں اور ہر ایک قسم کے حقوق وفرائض کو اسطرح الگ الگ مرتب کیا گیا کہ ایک قسم یا گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے آدمی سے، ایک رنگ کا انسان دوسرے رنگ کے انسان سے اور ایک علاقہ میں پیدا ہونے والا انسان دوسرے علاقہ میں پیدا ہونے والے انسان سے نہ میل جول رکھ سکتا تھا اور نہ برابری کی سطح پر لین دین کر سکتا تھا اور نہ ان سب گروہوں کے آپس میں مل جل کر بقائے باہمی کا تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔

آج ہمیں اور آپ کو اور دنیا کے بہت سے انسانوں کو یہ نظام مبنی بر ظلم معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس نظام کو غیر انسانی نظام کہتے ہیں لیکن جنوبی افریقہ کی چالیس لاکھ آبادی پر مشتمل سفید فام اقلیت اور مغرب میں اس کے کروڑوں حامی اس نظام کا دفاع کرتے نہیں تھکتے تھے، ان کو یہ نظام عدل وانصاف کے عین مطابق نظر آتا تھا، ان کو اس نظام میں خلاف عقل کوئی بات نظر نہ آتی تھی۔ مجھے **1984**ء میں وہاں کے وزیر خارجہ بوتھا صاحب سے جو بعد میں نائب صدر بھی رہے ملاقات کا اتفاق ہوا انکا تعلق سفید فام نسل سے ہے گفتگو کے دوران انہوں نے نسلی امتیاز کے اس نظام کا بھی ذکر کیا جس کو وہاں کی اصطلاح میں اپارتھیڈ کا نظام کہا جاتا تھا۔ میں نے اس سے عرض کیا کہ آپ کا یہ نظام بڑا عجیب وغریب ہے دنیا میں اس کو ناپسند کیا جاتا ہے ادارہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اس کے خلاف قراردادیں منظور کرتی رہتی ہے۔ پھر بھی آپ اس نظام پر قائم ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس پر انہوں نے اس نظام کے دفاع میں ایک بڑی مفصل گفتگو کی، اسکی خصوصیات اور اپنی دانست میں اسکے فوائد کا ذکر کیا ضروری نہیں کہ میں اور آپ اس سے اتفاق کریں لیکن میرے عرض کرنے کا

منشا یہ ہے کہ دنیا میں ہر نظام خواہ وہ کتنا ہی غیر عقلی اور غیر انسانی معلوم ہوتا ہو۔ اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور تصور حیات رکھتا ہے جس کی بنیاد پر وہ زندگی کی تمام تفصیلات طے کرتا ہے اس فلسفہ اور تصور حیات کی بنیاد پر وہ کچھ لوگوں کو اپنے سے قریب اور کچھ کو اپنے سے بعید قرار دیتا ہے لیکن اسلام نے ان میں سے کسی بنیاد کو بھی قبول نہیں کیا اپنے نظام کی بنیاد کے طور پر اس نے جغرافیائی وحدت، علاقائی قربت، نسلی عصبیت، لسانی یکجہتی یا ایسے ہی دوسرے تعصبات کو قبول نہیں کیا۔ اسلام نے صرف ایک چیز کو اپنے نظام کی بنیاد مانا یعنی عقیدہ توحید جسکے بارے میں اس نے اعلان کیا کہ یہ کائنات کی سب سے بڑی اور سب سے اولین حقیقت ہے اور جس پر تمام دنیا کے انسانوں کو متحد کر کے ایک بین الانسانی نظام اور بین الانسانی نظریہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ واضح بات ہے کہ نوع انسانی میں رنگ رنگ کی مخلوقات موجود ہیں ہر ایک کا ایک پیدائشی رنگ ہے جس کو بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ کوئی کالا گورا نہیں ہوسکتا اور کوئی گورا کالا نہیں بن سکتا۔ اسلئے ظاہر ہے کہ کسی ایک رنگ کی بالادستی کی بنیاد پر بنی نوع انسان کو متحد نہیں کیا جاسکتا۔ اسطرح دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جارہی ہیں اور ہزاروں زبانیں ماضی میں بولی جا کر فنا کے گھاٹ اتر چکیں ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ کتنی زبانیں وجود میں آئیں گی۔ لہذا کسی ایک لسانی بنیاد کو تمام انسانوں کیلئے اور رہتی دنیا تک کیلئے اساس وحدت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی حال نسلی بنیاد کا ہے دنیا میں سینکڑوں نسلیں موجود ہیں حقیقی بھی اور وہمی بھی۔ کوئی شخص جس طرح اپنا رنگ نہیں بدل سکتا اس طرح اپنی نسل بھی نہیں بدل سکتا۔

صرف نظریہ اور عقیدہ ہی ایسی چیز ہے جس پر دنیا کے انسانوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل متحد کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بنیادوں کے برعکس عقیدہ اور نظریہ انسان اپنی آزاد مرضی اور شعوری ارادہ اور اختیار سے اپناتا ہے۔ وہ غلط نظریات سے تائب ہو کر درست نظریہ جب چاہے اختیار کرلے۔ باطل عقائد سے جب توفیق ہو دستبردار ہو کر صحیح عقیدہ اپنالے۔ لہذا اگر انسان ایک عاقل اور باشعور مخلوق ہے تو اسکے نظام اور اجتماعیت کی بنیاد بھی اس کی شعوری کوشش اور عاقلانہ فیصلہ کی بنیاد پر قائم ہونی چاہئے اور وہ کوئی ایسی بنیاد ہی ہوسکتی ہے جسکو انسان اپنے آزادانہ فیصلہ سے اپنا سکے۔ رنگ، نسل اور جائے پیدائش انسان کے اپنے اختیارات سے باہر کی چیزیں ہیں۔ اسلئے ان کی بنیاد پر اسلام کے بین الاقوامی قانون کی عمارت استوار نہیں کی جاسکتی۔

اسلئے اسلام نے نظریہ اور عقیدہ ہی کو اجتماعیت کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا۔ اسی بنیاد پر اسلام کا سارا فلسفہ زندگی اور نظام حیات استوار ہوتا ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلام کے قانون بین الممالک کی اساس ہے اسی پر اسلامی ریاست کے تعلقات دوسری ریاستوں سے منظم ہوتے ہیں۔ جب ایک بار یہ بنیاد تسلیم کرلی جائے کہ جو انسان ایک مشترک عقیدہ اور نظریہ کے پابند ہیں وہ ایک الگ امت کی تشکیل کرتے ہیں تو یہ بات خود بخود تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ ان کے آپس کے تعلقات کی بنیاد بھی وہی عقیدہ اور نظریہ قرار پائیگا دوسروں سے ان کے تعلقات کی نوعیت کا تعین بھی ان نظریات اور عقائد ہی کے حوالہ سے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ نوعیت اس نوعیت سے مختلف ہوگی جو دوسرے انسانوں کے آپس کے تعلقات میں پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کتاب نے رنگ نسل اور زبان کو قومیت کی بنیاد کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ قرآن مجید نے

نظریہ اور عقیدہ ہی کو قومیت اور امت کی اساس مانا ہے۔ آپ قرآن کو اول سے لے کر آخر تک پڑھ جایئے تو اس میں آپکو یہ خطاب کہیں نہیں ملے گا کہ اے عربو! تم ایسا کرو، یا اے عجمیو! تم ایسا مت کرو، اے ایشائیو! اے افریقیو! ۔ اسکے برعکس قرآن پاک یا تو مجموعی طور پر بنی نوع انسان سے خطاب کرتا ہے یا پھر لوگوں کو ان کے عقائد ونظریات کے حوالہ سے یاد کرتا ہے۔ قرآن مجید میں کم از کم اٹھارہ مرتبہ بنی نوع انسان سے (یا ایھا الناس کہہ کر) خطاب کیا گیا ہے، یا وہاں مخاطبین کے عقیدہ اور مذہب کے حوالہ سے بات کہی گئی ہے مثلا یاایھا الذین اٰمنوا، یا اھل الکتاب وغیرہ۔ اسکا واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں تعلقات کی اساس اور سارے لین دین کی بنیاد یہ ہے کہ متعلقہ انسانوں کا تعلق اپنے خالق سے کس نوعیت کا ہے، متعلقہ لوگ کس نظریہ کے پیروکار ہیں اور کس عقیدہ یا اصول کو اپنی زندگی کا محور قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے مادر وطن' مدر لینڈ یا فادر لینڈ جیسے الفاظ استعمال نہیں کئے۔ اسکے برعکس انکے ہاں دار الاسلام، دار الکفر، دار الحرب، دار العہد اور دار الصلح وغیرہ اصطلاحات ملتی ہیں جن سے متعلقہ علاقہ کی قانونی حیثیت اور اسلام کے بارے میں اسکے باشندوں کے طرز عمل کا فوراً اظہار ہو جاتا ہے۔ ان میں سے جو بھی اصطلاح استعمال کی جائے گی اس سے فوراً پتہ چل جائیگا کہ متعلقہ علاقہ میں اسلام کی بالادستی ہے یا وہاں کفر کے احکام چلتے ہیں وہ علاقہ مسلمانوں سے برسر جنگ ہے یا وہ علاقہ ہے جہاں مسلمان امن وامان سے ہیں' یا وہ علاقہ جہاں کے مسلمانوں کو امن وامان میسر نہیں ہے۔ ان تمام تقسیموں میں سے بعض مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور بعض تقسیمیں وقتی اور عارضی حیثیت کے حامل ہیں۔ لیکن ان سب کی بنیاد اور اساس اسلام سے وابستگی یا عدم وابستگی اور اہل اسلام کے ساتھ ان کے طرز عمل ورویہ پر ہے۔

آج انٹرنیشنل لاء جن مسائل پر سب سے زیادہ بحث کرتا ہے ان میں دائرہ کار یا دائرہ اختیار (یعنی جورس ڈکشن) کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کسی ریاست کا دائرہ کار کسی علاقہ تک ہے کس علاقہ اور کس سرحد سے دوسری ریاست کا دائرہ اختیار شروع ہوتا ہے ان سوالات کے واضح اور دوٹوک جواب کی بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی تعلقات میں بڑی اہمیت ہے ان سوالات کے قطعی جواب پر بین الاقوامی نوعیت کے بہت مسائل کا دارومدار ہے فقہائے اسلام نے بھی دائرہ اختیار Jurisidiction کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ علم سیر کی کتابوں میں دار الاسلام کے دائرہ اختیار (علاقائی اور موضوعاتی دونوں) کے بارے میں بحثیں ملتی ہیں۔ لیکن انہوں نے اسکی بنیاد کسی نسلی یا علاقائی یا جغرافیائی وطنیت پر نہیں رکھی۔ انکے ہاں کسی کے مرز وبوم کو بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت حاصل نہیں، ان کے ہاں ان سب چیزوں کی بنیاد نظریہ اسلام سے وابستگی پر ہے۔

دار الحرب اور دار الاسلام کی تعریف:

فقہائے اسلام کی نظر میں دار الاسلام وہ علاقہ ہے جہاں (1) مسلمان آزادی اور سکون سے رہتے ہیں اور جہاں ان کو اسلامی احکام پر عمل کرنے اور شعائر اسلام کے اظہار کی کھلی آزادی ہو (2) جہاں نظریہ اسلام کی بالادستی ہو (3) مسلمان سیاسی اعتبار سے آزاد اور

خود مختار ہوں۔ یہ وہ تین بنیادی شرائط ہیں جو امام ابوحنیفہؒ نے بیان کی ہیں لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ دوسرے فقہاء اس سے اختلاف کرتے ہیں بلکہ یہ شرائط مختلف الفاظ میں سبھی فقہاء نے بیان کی ہیں البتہ ان شرائط ومباحث کو جس اختصار، وضاحت اور جامعیت سے امام ابوحنیفہؒ نے بیان کیا ہے اسکی وجہ سے انکا حوالہ ان مباحث میں بڑی کثرت سے ملتا ہے ۔دار اور علاقہ کا یہ تصور اور اس بنیاد پر یہ تقسیم اسلام کے بین الاقوامی قانون کا سب سے اہم موضوع بلکہ دیگر تمام مباحث کی بنیاد ہے۔آپ فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو دارالاسلام اور دارالحرب کی دو اصطلاحات جا بجا اور بڑی کثرت سے نظر آئیں گی۔ان اصطلاحات سے بعض اوقات کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مسلمان دارالاسلام سے باہر ساری دنیا کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور ہر غیر مسلم سے سدا برسر پیکار رہنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ نہ دارالحرب کے یہ معنی ہیں اور نہ دارالاسلام سے باہر کے علاقوں کیلئے دارالحرب واحد اصطلاح ہے دارالحرب کی تعریف امام ابوحنیفہؒ کے نقطہ نظر کی رو سے (جن کے موقف کو سمجھنے میں بہت غلطیاں ہوتی آئی ہیں) یہ کہ دارالحرب وہ علاقہ ہے جہاں اسلام کے احکام نافذ نہ ہوں، جو غیر مسلموں کے سیاسی اقتدار و بالادستی کے تابع ہو اور جہاں یا تو مسلمانوں کو امن وتحفظ حاصل نہ ہو یا اگر حاصل ہو تو وہ کسی غیر مسلم قوت کی عطا کا نتیجہ ہو۔

دار الحرب کے اس مفہوم کو ادا کرنے کیلئے دیگر فقہائے کرام نے دارالحرب کے ساتھ ساتھ دار الکفر ، دارالصلح ، دارالعہد کی اصطلاحات ہی استعمال کی ہیں جن سے متعلقہ علاقہ کے لوگوں سے اسلامی ریاست (دارالاسلام) کے تعلقات کی نوعیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔اسی طرح دارالبغی بھی ایک اصطلاح ہے جو ان علاقوں کیلئے استعمال ہوتی ہے جہاں باغیوں نے قبضہ کرلیا ہو اور وہ عارضی طور پر دارالاسلام کے سیاسی اقتدار کے تابع اور انتظامی اختیار کے ماتحت نہ ہو۔ان سب داروں کے الگ الگ احکام ہیں جن کی تفصیل کتب فقہ کے ابواب السیر میں عام ملتی ہے۔

اسلام کے بین الاقوامی قانون کا دوسرا بڑا موضوع جس کا اس اساس سے بڑا گہرا تعلق ہے جسکا ابھی ذکر کیا گیا۔وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فرق اور اس کی نوعیت ہے ظاہر بات ہے کہ اسلام بنیادی طور پر ایک نظریہ ہے جسکے ماننے والے اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں، وہ نہ صرف اپنی اس انفرادیت کو الگ رکھنے پر اصرار کرتے ہیں بلکہ دوسرے نظریات کے ماننے والوں کی اپنی اپنی انفرادیتوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور ان کا بھی تحفظ کرنا چاہتے ہیں لہذا فطری طور پر اسلام کا موضوع بحث وہ لوگ بھی بنتے ہیں جو مختلف نظریات پر ایمان رکھنے کی وجہ سے کوئی جداگانہ تشخص اور انفرادیت رکھتے ہوں۔اسلام کا قانون بین الممالک کسی ریاست پر بحث کرنے سے قبل اس ریاست میں بسنے والے ان گروہوں سے بحث کرتا ہے جو اسلامی نظریہ پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ کسی اور نظریہ یا نظریات کو مانتے ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف نظریات اور متضاد خیالات پر مبنی نظاموں کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ اسلامی ریاست اور مسلمانوں کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔فقہ کے مباحث میں ایک جملہ جس کا بار بار ذکر ملتا ہے یہ ہے الکفر ملة واحدة یعنی کفر سارا کا سارا ایک ہی ملت متصور ہوگا اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ دارالحرب یا دارالکفر میں اگر مختلف نظریات اور

مذاہب پائے جاتے ہوں تو ان کو تسلیم نہ کیا جائیگا یا مختلف نظریات پر کاربند ریاستوں اور مملکتوں کو الگ الگ سیاسی وحدتوں کے طور پر تسلیم نہ کیا جائیگا۔ یا ان سب سے ایک ہی جیسے تعلقات رکھنے کو لازمی سمجھا جائیگا۔ اس اصول کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اسلام کے دائرہ سے باہر جتنے بھی نظریات، عقائد اور فلسفے پائے جاتے ہیں اور ان کی بنیاد پر جو بھی ریاستیں اور حکومتیں وجود میں آتی ہیں ان سب کو اس اعتبار سے دارالاسلام سے الگ ایک منفرد کیٹگری کے طور پر تسلیم کیا جائیگا کہ وہاں کے مسلمان شہریوں کا برتر قانون اسلام نہیں ہے اور وہاں اسلام کو وہ آزادی اور مقام حاصل نہیں ہے جو اس کو دارالاسلام میں حاصل ہے لیکن جہاں تک غیر مسلموں کے مختلف گروہوں سے تعلقات کا سوال ہے تو وہ الگ الگ نوعیت کے ہوں گے۔ اسلامی نظریہ سے ان کے نظریہ کے قرب اور بُعد اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے رویہ اور طرز عمل کی بنیاد پر ان سے روابط تشکیل دیئے جائیں گے اس اعتبار سے نہ کفر ایک کیٹگری ہے اور نہ اہل کفر سب کے سب ایک قوم ہیں۔ خود قرآن پاک میں ان کا الگ الگ ذکر موجود ہے۔ اہل کتاب، صائبین، مجوس، مشرکین اور منافقین کا قرآن میں الگ الگ ذکر آیا ہے اور انکے الگ الگ احکام بیان کئے گئے ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خود قرآن نے سارے غیر مسلموں کو ایک زمرہ میں شامل نہیں کیا بلکہ انکے الگ الگ زمرے اور قسمیں قرار دی ہیں۔ لہذا ان سے تعلقات کی نوعیت بھی مختلف ہوگی جس کا عقیدہ اور نظریہ اسلامی تعلیمات سے جتنا قریب اور جسکا طرز عمل مسلمانوں سے جتنا دوستانہ اور مصالحانہ ہوگا اس کے ساتھ تعلقات اتنے ہی قریبی اور دوستانہ ہوں گے اور اس کو اتنی ہی مراعات دی جائیں گی اس کے برعکس جو قوم، گروہ یا ملک نظریہ توحید اور عقیدہ اسلام سے جتنا دور ہوگا اور جس کا طرز عمل مسلمانوں کے ساتھ جتنا مخالفانہ اور معاندانہ ہوگا اس سے تعلقات بھی ویسے ہی ہوں گے ایسے گروہوں سے تعلقات اور لین دین میں مسلمانوں کو اتنا ہی محتاط رہنے کا حکم دیا گیا۔

آج بھی حکومتیں بین الاقوامی تعلقات میں بعض اقوام اور ممالک کو سب سے زیادہ مراعات یافتہ قوم (موسٹ فیورٹ نیشن) کا درجہ دیتی ہیں۔ یہ درجہ وقتی سیاسی مفادات اور عارضی معاشی مصالح کی بنیاد پر دیا جاتا ہے اس طرح کی عارضی اور وقتی مراعات کی اسلام نے بھی اجازت دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک درجہ دائمی نوعیت کی مراعات کا بھی ہے جو قوموں کے نظریہ اور عقیدہ کی بنیاد پر ہے سب سے زیادہ مراعات یافتہ قوم کا یہ درجہ قرآن مجید نے اہل کتاب کو عطاء کیا ہے جن سے بعض ایسے تعلقات قائم کرنے اور رکھنے کی بھی اجازت ہے جو دوسری اقوام وملل سے رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ مثلاً اہل کتاب کی پاک دامن خواتین سے شادی کرنے کی اجازت ہے، جبکہ کسی دوسرے مذہب کی عورت سے شادی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اہل کتاب کا ذبیحہ اگر درست طریقہ سے ہو تو اس کا کھانا جائز ہے۔ کسی اور قوم کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں۔

اہل کتاب کو یہ خاص حیثیت اس لئے دی گئی کہ وہ بڑی حد تک ان بنیادوں میں مسلمانوں سے متفق ہیں جن بنیادوں پر نظریہ اسلام کی عمارت استوار ہوتی ہے، ان میں سے بہت سے واقعتاً توحید کے قائل ہیں، نظری طور پر وہ بھی توحید کے مدعی ہیں، وہ سب کے سب وحی کے قائل ہیں، اللہ تعالی کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں، انبیاء کرام اور کتب سماویہ کے سلسلہ کو تسلیم کرتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں۔ یہی وہ

بنیادی تصورات ہیں جن پر اسلام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسلئے جو قومیں ان تصورات کو تسلیم کرتی ہیں ان کیلئے خصوصی مراعاتی احکام دیئے گئے ہیں۔ اس سے پتا چلا کہ قرب اور بُعد کا دارومدار اسلامی عقائد سے قرب اور بُعد پر ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک، سنت رسول اور فقہی ادب میں غیر مسلموں کو بہت سے زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون نے ان تمام زمروں سے الگ الگ بحث کی ہے، ان کے جدا جدا احکام مرتب کئے ہیں اور ان سب سے مسلمانوں کے تعلق کی نوعیت اور تفصیلات بیان کی ہیں چنانچہ فقہ کی کتابوں میں اہل ذمہ سے تعلقات، اہل ذمہ کے حقوق، مرتدوں سے اسلامی ریاست کا تعلق اور مرتدوں کے احکام، عارضی طور پر ریاست میں آنے والے غیر مسلموں کے احکام، اہل کتاب اور غیر اہل کتاب، مشرکین اور مجوس، شبیہ اہل کتاب اور شبیہ مجوس وغیرہ گروہوں کے احکام کی تفصیلات ملتی ہیں۔ غیر مسلموں کی یہ قسمیں اسلامی قانون بین الاقوامی کا اہم موضوع ہے اور اس علم کے اہم اور بنیادی مباحث میں سے ہے چنانچہ اسلامی ریاست سے تعلقات کے حوالہ سے جن غیر مسلموں سے بحث ہوتی ہے وہ عموماً درج ذیل عنوانات کے تحت ملتی ہے:-

1..... **اھل ذمہ**:- یعنی وہ غیر مسلم جن کی حفاظت اور جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری اسلامی ریاست نے لی ہے۔ ان میں وہ غیر مسلم بھی شامل ہیں جو کسی مفتوحہ علاقہ کے باشندے ہوں (اہل عنوہ) اور وہ غیر مسلم بھی جو کسی معاہدہ کے نتیجہ میں ریاست کے شہری بنے ہوں (معاہدین)

2..... **اھل صلح**:- وہ غیر مسلم باشندے جن کے فرمانروا یا حکومت سے مصالحت ہوگئی ہو اور اس مصالحت کے نتیجہ میں ان کو بعض حقوق و مراعات دی گئی ہوں۔

3..... **مستامنین**:- کسی دشمن یا اجنبی ریاست کے وہ شہری جو عارضی طور پر اسلامی ریاست میں داخل ہوئے ہوں اور ان کو اجازت (امان/ ویزا) دی گئی ہو۔

4..... **مرتدین**:- وہ بدبخت مسلمان جو اسلام قبول کرنے کے بعد یا مسلمان رہنے کے بعد اسلام سے پھر گئے ہوں۔ اسلامی قانون نے اس زمرہ کے غیر مسلموں کو بدترین قسم کے غیر مسلم قرار دیا ہے اور ان کو ان مراعات اور تحفظات کا حقدار قرار نہیں دیا جو دوسرے غیر مسلموں کو حاصل ہیں۔

5..... **محاربین**:- وہ مسلم یا غیر مسلم جو اسلامی ریاست کے شہری ہوتے ہوئے ریاست کے خلاف طاقت استعمال کریں اور بدامنی پیدا کر کے لوگوں کے جان و مال کو خطرہ میں ڈال دیں۔

6..... **اھل بغی**:- وہ مسلم یا غیر مسلم جو ریاست کی جائز حکومت کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوں اور جتھا بندی کے ذریعہ کسی علاقہ پر قابض ہو جائیں۔

7..... **سفراء**:- وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ریاست کے ایلچی بن کر اسلامی ریاست میں آئیں اور پیغام رسانی کا فریضہ انجام

دیں۔سفیر کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی ریاست ہر حال میں ذمہ دار ہے، چاہئے اس کی ریاست سے مسلمان بالفعل برسر جنگ ہی ہوں۔حتی کہ مرتدین کے ایلچی کو بھی یہ تحفظات حاصل ہیں۔

8..... **تاجر**:-وہ غیر مسلم تاجر جو ریاست کے قانون کے مطابق تجارتی سرگرمیوں کی غرض سے اسلامی ریاست کی حدود میں داخل ہوں غیر مسلموں کے ان زمروں کے علاوہ خود مسلمانوں کے کئی گروہ ایسے ہیں جن سے اسلام کا بین الاقوامی قانون بحث کرتا ہے۔ان میں اسلامی ریاست کی حدود سے باہر بسنے والے مسلمان خاص طور پر زیر بحث آتے ہیں۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نہ شریعت نے کہیں یہ مطالبہ کیا ہے اور نہ تاریخ میں عملاً ایسا ہوا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان ایک ہی اسلامی ریاست کے باشندے ہوں یا رہے ہوں۔خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ریاست اسلامی کی بقاء کیلئے ناگزیر تھا اور ہجرت (یعنی اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ میں آبسنے) کو فرض قرار دے دیا گیا تھا اس وقت بھی اس فرض سے ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا جو ہجرت کی استطاعت یا وسائل نہیں رکھتے تھے، یا جن کا ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجانا دعوت اسلامی کے مصالح کے لحاظ سے مناسب نہ تھا چنانچہ مدینہ منورہ سے باہر مستضعفین کے علاوہ بھی مسلمانوں کی قابل ذکر آبادیاں موجود تھیں۔

حبشہ کے مسلمانوں سے سیرت کا ہر طالبعلم واقف ہے۔ابھی رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ ہی میں قیام پذیر تھے کہ کفار مکہ کے بے پناہ ظلم و تشدد سے مجبور ہو کر پہلے پندرہ سولہ صحابہ اور صحابیات پر مشتمل ایک ننھا سا قافلہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے حبشہ گیا اور پھر فوراً ہی بعد حسب اختلاف روایات 102 صحابہ اور صحابیات یا 73 مردوں اور 18 خواتین پر مشتمل دوسرا قافلہ روانہ ہوا یہ ہجرت نبوت کے پانچویں چھٹے سال میں شروع ہوئی اور کئی مراحل میں کر کے کئی سو حضرات نے اس میں حصہ لیا۔یہ حضرات حبشہ میں ہی مقیم رہے اور ان میں سے بعض حضرات حضرت جعفر طیارؓ کی سرکردگی میں 7ھ کے اوائل میں مدینہ منورہ واپس آگئے جبکہ بڑی تعداد وہیں مقیم رہی۔خود حبشہ میں ان صحابہ کرام کی تبلیغ کے نتیجہ میں بہت سے مقامی لوگ بھی مسلمان ہوئے اور وہاں مسلمانوں کی آبادی مسلسل بڑھتی رہی۔حبشہ کے علاوہ مسلمانوں کی ایک قابل ذکر تعداد مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر رہی خلفائے راشدین کے زمانہ میں عرب کے باہر بھی دوسرے شہروں اور ملکوں میں مسلمانوں کی آبادیاں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئیں۔حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں بمبئی اور تھانہ اور حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں بلوچستان اور جنوبی اندلس میں مسلمان آبادیوں کا ذکر عرب مورخین نے کیا ہے۔خلفائے راشدین کے مبارک دور کے بعد تو دنیا کا شاید ہی کوئی قابل ذکر شہر ایسا رہا ہو جہاں مسلمان آبادیاں نہ رہی ہوں۔

امت مسلمہ کی عالمی برادری :

ظاہر ہے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد رکھنے والے یہ مسلمان کبھی بھی اسلامی ریاست کے شہری نہیں رہے خود رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی مسلمانان حبشہ کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آرہیں یا اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی قبول کریں۔اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں مسلمانان بمبئی تھانہ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں مسلمانان بلوچستان و اندلس کو کبھی اس کا پابند نہیں کیا

گیا کہ وہ لازماً اسلامی ریاست کی شہریت اختیار کرلیں۔ بلکہ وہ بدستور اپنے اپنے علاقوں کے باشندے رہے اور اپنے اپنے ممالک کی شہریت انکو حاصل رہی۔ لیکن انکے کسی غیر مسلم ریاست کے شہری ہونے کے یہ معنی کبھی نہیں لئے گئے کہ اسلامی ریاست ان تمام مسلمانوں سے کلیتاً لاتعلق رہے گی اور انکو امت مسلمہ کی عالمی برادری سے خارج کر دیا جائیگا۔ یہ سب مسلمان عالمگیر مسلم برادری کے رکن اور امۃ اسلامیہ کے افراد ہوں گے اور رہیں گے۔ عالمگیر مسلم برادری اور امۃ اسلامیہ کے افراد وارکان کی حیثیت سے ان کے حقوق وفرائض ختم نہیں کئے جاسکتے ایسے مسلمانوں سے اسلامی ریاست کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں خود قرآن پاک میں بنیادی ہدایت دے دی گئی ہیں اور احادیث نبوی میں ان کی وضاحت آئی ہے جس کی بنیاد پر فقہاء نے تفصیلی قواعد وضوابط اور قوانین مرتب کئے ہیں ان تعلقات کا بڑا دارومدار اس ریاست سے تعلقات کی نوعیت پر ہے جہاں وہ مسلمان آباد ہیں۔ ایک غیر مسلم ملک کے باشندوں سے ہمارے تعلقات دوستی کے بھی ہوسکتے ہیں اور دشمنی کے بھی ہوسکتے ہیں۔ وہاں جو مسلمان آباد ہوں گے ان سے ہمارے تعلقات کے انداز اس ملک سے دوستی یا دشمنی سے لامحالہ متاثر ہوں گے اس تبدیلی کا شریعت کے احکام میں بھی لحاظ رکھا گیا ہے خود قرآن پاک میں بعض ایسی صورتوں کی صراحت کی گئی ہے جہاں اسلامی برادری کے تقاضوں کے برعکس متعلقہ ملک سے دوستی اور معاہدہ کے تقاضوں کا زیادہ لحاظ رکھا جانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ بہرحال ان مسلمانوں سے تعلقات اور ان کو منضبط کرنے والے احکام اسلام کے بین الاقوامی قانون کا تیسرا اہم موضوع ہے۔ اس ضمن میں جن عنوانات کے تحت بحث کی جاتی ہے ان سے چند اہم موضوعات درج ذیل ہیں۔

الف:- دارالبغی کے مسلمان:- دارالبغی سے مراد وہ علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کا کوئی گروہ وہاں کی قائم شدہ جائز حکومت سے بغاوت کر کے قابض ہو جائے اور قانون شریعت کی غلط تعبیر کا سہارا لے کر اپنے جداگانہ حکومت قائم کر کے وہاں کا نظام چلانے لگے۔ دارالبغی کے ان باشندوں کیلئے جو وہاں کے نظام کے فعال مؤید ہوں اہل بغی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

ب:- دارالحرب کے مسلمان ان کے نکاح وطلاق کے معاملات، ان کا لین دین اور تجارتی معاملات۔

ج:- دو مسلم ریاستوں کے تعلقات۔

4..... اسلام کے قانون بین الممالک کا چوتھا بڑا موضوع جہاد یا اسلام کا تصور جنگ ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جہاں اسلام کی دی ہوئی اصلاحات نے بڑے دوررس اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ اسلام وہ پہلا نظام ہے جس نے جنگ اور عسکری قوت کے استعمال کو عملاً ایک قاعدہ اور اخلاقی اصول کا پابند بنا کر کے دکھا دیا۔

اسلام کا قانون جنگ اخلاقی بالادستی کا پابند رہا ہے :

جنگ وجدل انسان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے جب سے انسان روئے زمین پر پایا جاتا ہے فساد اور لڑائی بھی موجود ہے۔ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی کہنے والوں نے کہہ دیا تھا کہ **یفسد فیھا ویسفک الدماء** یعنی وہ یہاں فساد بھی کرے گا اور خون بھی بہائے گا۔ اس شبہ کے جواب میں خالق کائنات نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا بلکہ یہ فرمایا کہ اس مفسد اور سفاک مخلوق کی پیدائش میں حکمت پنہاں

ہے وہ میں جانتا ہوں۔لہذا فساد اور سفا کی انسان کی جبلت میں داخل معلوم ہوتی ہے لیکن اس جبلی سفا کی اور پیدائشی فساد کے جذبہ کو کسی قاعدہ اور قانون کا پابند کیا جائے، کسی اخلاقی ضابطہ سے اس رجحان کو منضبط کیا جائے اور اس داعیہ کو کسی مثبت ہدف کیلئے استعمال کیا جائے۔یہ پہلی بار کامیاب طریقہ سے اسلام نے ہی کر کے دکھایا ہے۔

یوں تو تمام انبیاء علیم السلام نے ہمیشہ ہی عدل وانصاف اور اعتدال وتوازن (قسط اور میزان) کی دعوت دی جیسا کہ سورۃ حدید کی آیت 25 میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔لیکن بہت سے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو ان کے مخالفین نے قبول نہیں کیا اور اگر قبول کیا بھی تو ان اقوام کے اثرات محدود رہے۔دنیا کی معروف مذہبی تاریخ میں صحابہ کرام نے پہلی بار انسانیت کو ایک ایسے قانون جنگ سے متعارف کرایا جس میں اخلاقی بالادستی کی روشن مثالیں انسانی تاریخ کا سنگ میل قرار دی جاسکتی ہیں۔اسلام نے دنیا کو جو قانون جنگ دیا اسکی پاسداری کے نمونے رہتی دنیا تک انسانوں کیلئے مشعل راہ رہیں گے دنیا کی دیگر اقوام میں کتنی قومیں ہیں جنہوں نے جنگ اور عسکری قوت کو قانون اور عدل وانصاف کے تابع کر کے دکھا دیا ہو۔ایسی مثالیں اسلام نے ہی پیش کی ہیں۔دنیا میں کون سی فاتح قوم ایسی گذری ہے جس نے اپنی فتوحات کو اسلئے کالعدم کر دیا ہو کہ فتوحات کے دوران فاتحین سے قانون کے احکام کی خلاف ورزی ہوگئی تھی۔یہ مثالیں مسلمانوں ہی نے پیش کی ہیں۔یہ اسلام ہی کی دی ہوئی اخلاقی تربیت کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی شمشیر خاراشگاف قانون شریعت کی تابع رہی۔

دوسری صدی ہجری کا وسط مسلمانوں کے عروج کا زمانہ ہے یہ وہ دور ہے جب معروف دنیا کے بیشتر حصہ پر اسلام کا پرچم لہرا رہا ہے۔ تینوں براعظموں پر اُنکی حکومت قائم ہے دنیا کی ہر طاقت اُنکے سامنے سراطاعت خم کر چکی ہے اور کوئی بڑے سے بڑا حکمران مسلمانوں کا راستہ روکنے کی ہمت اور جرات نہیں کر سکتا۔ان دنوں وسطی ایشیاء کے مسلمان فاتح قتیبہ بن مسلم جن کو بجا طور پر فیلڈ مارشل کے لقب کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے سمرقند میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں اس فاتحانہ داخلہ میں نہ کسی کی عزت وآبرو پر آنچ آتی ہے، نہ کسی کی جائیداد اور مال وزر کو کوئی برے ارادہ سے دیکھتا ہے اور نہ اخلاق وکردار سے ہٹ کر کوئی حرکت کسی سے سرزد ہوتی ہے لیکن اس فاتحانہ داخلہ کے موقعہ پر بعض ایسی شرائط کی پاسداری کرنے میں کوتاہی ہو جاتی ہے جو محض رسمی (Formal) نوعیت کی سمجھی گئی تھیں لوگوں کے کہنے سننے پر بعض مقامی باشندے قاضی عسکر کے روبرو عرضداشت پیش کرتے ہیں کہ چونکہ دوران فتح فلاں فلاں شرائط کی پاسداری نہیں کی گئی اسلئے یہ ساری کاروائی کالعدم قرار دی جائے اور فوج کو حکم دیا جائے کہ وہ شہر خالی کر دے۔

چنانچہ سمرقند شہر کے بدھ باشندوں نے قاضی عسکر کے روبرو فیلڈ مارشل قتیبہ بن مسلم کے خلاف عرضداشت دائر کر دی۔قاضی نے اپنے ہی سپہ سالار کے خلاف غیر مسلموں کی شکایت سنیں اور سپہ سالار اسلام کا موقف بھی سنا۔اور حکم دیا کہ شہر خالی کر دیا جائے۔چنانچہ جو شہر فاتح اعظم نے اپنی شمشیر خاراشگاف سے فتح کیا تھا وہ اس نے اپنے مقرر کردہ قاضی کے حکم پر بلا چون وچرا خالی کر دیا اہل شہر میں منادی کرادی گئی کہ اگر اس پورے عمل کے دوران کسی کا کوئی بیجا نقصان ہوا ہو تو وہ اسلامی شریعت کے مطابق تاوان طلب کر سکتا ہے۔

یہ واقعہ (جو مورخ بلاذری نے فتوح البلدان کے باب فتح سمرقند میں بیان کیا ہے) قانون جنگ کی تاریخ میں ایک منفرد مثال ہے۔

یہ نہ صرف اپنی نوعیت کی پہلی بلکہ شاید آخری مثال ہے کہ کسی فاتح نے کسی عسکری یا سیاسی دباؤ کے بغیر محض عدالتی حکم پر اپنی فتوحات کو قانون اور اخلاق کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کر دینے کیلئے پیش کر دیا ہو۔

5 ..... اسلام کے قانون بین الاقوام کا پانچواں بڑا موضوع جنگ کے تفصیلی اور عملی احکام ہیں جو اسلام کے تصور جہاد اور فلسفہ جنگ پر مبنی ہیں۔ قانون جنگ میں اسلام نے جو تاریخ ساز اصلاحات کی ہیں ان کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے ابتدائی 2 صدیوں میں ہی ایک مفصل قانون مرتب کر کے رکھ دیا تھا۔ اس قانون جنگ میں اسلامی جہاد دعوت اور ہجرت کے موضوعات اساسی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی پر اس سارے مفصل قانون کی عمارت استوار ہوتی ہے جہاد دعوت اور ہجرت کے آپس کے فکری ربط کو نظر انداز کر دینے کے نتیجہ میں بہت سی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ اسلام ہی نے پہلی بار دنیا کو عملاً ایک ایسا قانون جنگ نافذ کر کے دکھایا جس کی بنیاد اخلاقی تصورات اور انسانی اقدار پر تھی۔ ایسا قانون جس میں جنگ ایک اخلاقی فریضہ کی حیثیت رکھتی تھی، جس میں جنگ ظلم و تعدی اور ناانصافی کو روکنے کیلئے جائز قرار دی گئی تھی۔ جس میں صرف فتنہ و فساد کو مٹانے کیلئے جنگ کو ضروری ٹھہرایا گیا تھا۔

اسلام نے پہلی بار دنیا کو ایک ایسے قانون جنگ سے روشناس کرایا جسکا مقصد جنگ اور طریق جنگ دونوں کی پوری اصلاح اور ان دونوں تصورات کی از سر نو تعمیر و تشکیل تھی۔ اسلام کا قانون جنگ تاریخ انسانیت کا وہ پہلا مرتب اور باضابطہ قانون ہے جس نے مقاتلین و محاربین کے بھی حقوق متعین کئے۔ خود طریق جنگ کیلئے مہذب اور مبنی بر عدل و انسانیت قواعد وضع کئے۔

6.....اسلام کے قانون بین الممالک کا چھٹا بڑا موضوع غنائم و انفال کے احکام اور ان کی تقسیم کی تفصیلات ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جس دور میں یہ قوانین مرتب کئے جا رہے تھے وہی دور مسلمانوں کے عروج کا دور آغاز تھا۔ اسلامی قوانین کا تشکیلی دور جو عہد خلفائے راشدین کے آغاز سے کم و بیش دوسری صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا اسلامی فتوحات کی وسعت کا بھی دور تھا۔ اس دور میں ہر مسلمان خالص دینی جذبہ سے جہاد میں حصہ لیتا تھا۔ علماء اپنی اپنی مسجدیں اور درسگاہیں چھوڑ کر اور قاضی و مفتی اپنی اپنی عدالتیں چھوڑ کر جہاد میں حصہ لینے کو نہ صرف اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے بلکہ اس سعادت کو اپنے لئے اعزاز و شرف کی بات سمجھتے تھے، جب اور جوں ہی ان کو موقع ملتا وہ قلم رکھ کر تلوار سنبھال لیتے۔

ان حالات میں کل وقتی اور تنخواہ دار سپاہی بہت کم ہوتے تھے۔ اکثر و بیشتر وہ لوگ جہاد میں حصہ لیتے تھے جو یہ خدمت خالص نسبتاً للہ انجام دیتے تھے اور کسی فوری دنیوی مقصد کا حصول ان کے پیش نظر نہ ہوتا تھا۔ ان کو صرف جہاد کی فضیلت اور مجاہد فی سبیل اللہ کا مرتبہ حاصل کرنے سے غرض ہوتی تھی۔

ایک ایسی ریاست میں جسکی سرحدی حدود فرانس سے لیکر منگولیا تک اور موجودہ آرمینیا سے جنوبی سوڈان تک پھیلی ہوئی ہوں جہاد کے عمل میں حصہ لینا دو ایک دن کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ذرائع آمد و رفت کے اس مرحلہ میں یہ کام دو ایک ماہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کام کیلئے کئی کئی سال کی طویل مدت درکار ہوتی تھی جو شخص بھی جہاد کیلئے نکلتا تھا وہ برسوں کیلئے نکلتا تھا اور اس کو گھر سے ہزاروں میل دور کا سفر کر کے جانا پڑتا تھا تب جا کر قریب ترین میدان جہاد تک پہنچ پاتا تھا اس ساری مہم میں دو دو، تین تین اور کبھی کبھی چار چار، پانچ پانچ سال لگ جاتے تھے۔

ان حالات میں بیشتر لوگوں کے مالی وسائل ایسے طویل سفر کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اسلئے کہ خود اتنے طویل سفر کے اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ گھر والوں کی معاشی ضروریات کا بندوبست کرنا اور دوران قیام خود اپنے لئے ضروری وسائل (ہتھیار، خوراک، لباس، سواری وغیرہ) کی باقاعدہ فراہمی کو یقینی بنانا بڑے مادی اور مالی وسائل کا متقاضی تھا۔ لہذا ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے رضا کار مجاہدین کو معاشی وسائل فراہم کئے جائیں، ان کے اہل خاندان کی روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل کا سامان کیا جائے اور اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ جب وہ جہاد کے فریضہ میں حصہ لے کر سرخرو ہو کر سالہا سال میں وطن واپس لوٹیں تو خالی ہاتھ گھر نہ آئیں بلکہ اہل خانہ کیلئے کچھ پس انداز کر کے بھی لائیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں مال غنیمت کی تقسیم اور اس کے قواعد نے بڑی اہمیت اختیار کر لی۔

غنیمت میں کون کون سی چیزیں شامل ہوں گی؟ غنیمت کی تقسیم کیسے اور کن اصولوں کی بنیاد پر عمل میں آئے گی؟ غنائم کا حقدار کون ہے؟ ان تمام سوالات کے جوابات اور ان سے متعلقہ امور پر بحث اسلام کے قانون بین الاقوام اور بالخصوص قانون جنگ کا ایک اہم باب قرار پائی۔ غنیمت کی تقسیم اور اس میں حصہ کا استحقاق کسی نسل، علاقہ یا زبان سے وابستگی کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ اس کی بنیاد سبقت فی الاسلام اور خدمت اسلام پر تھی۔ جس شخص نے جنگ میں جتنے وسائل فراہم کئے وہ اتنے ہی حصہ کا مستحق قرار پایا۔ جن لوگوں کی خدمات سب سے طویل تھیں اور جن کو جہاد و دعوت میں حصہ لینے کے زیادہ موقع ملے تھے ان کا حصہ غنائم میں دوسروں سے زیادہ تھا مثلاً جو شخص تنہا آتا تھا اس کا حصہ کم اور جو اپنی سواری کا جانور خود لاتا تھا اسکا حصہ زیادہ تھا۔ ایک شخص کا ریکارڈ خدمت اسلام میں پچاس سال پر محیط ہے، اسکا حصہ ان لوگوں سے زیادہ رکھا گیا جو مثلاً آج ہی مسلمان ہوئے ہوں۔

دوسری صدی ہجری میں لکھی جانے والی کتابوں میں یہ مباحث عام ملتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے کل وقتی، باقاعدہ اور تنخواہ یاب فوج کا رواج بڑھتا گیا غنائم کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی اہمیت سے یہ مباحث امام شافعیؒ، امام اوزاعیؒ اور ان کے ہمعصر فقہاء کے ہاں ملتے ہیں اتنی اہمیت کے ساتھ بعد کے فقہاء کے ہاں نہیں ملتے۔

7.....اسلام کے قانون بین الممالک کا ایک اور اہم باب جس پر ہر دور میں بڑی اہمیت کے ساتھ لکھا گیا وہ جنگی قیدیوں کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ ہر دور اور ہر علاقہ میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے، ہر زمانہ میں اور ہر تہذیبی پس منظر میں اس موضوع پر لکھا گیا، دستاویزیں مرتب ہوئیں، کنونشن اور مذاکرے منعقد ہوئے اور متعدد علاقائی اور بین الاقوامی معاہدات اور وثیقے لکھے گئے لیکن عمل کی دنیا میں جنگی قیدیوں کا مسئلہ جہاں پہلے تھا بہت حد تک وہیں آج بھی ہے۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں اسلام کے موقف اور مسلمانوں کے طرز عمل کے بارے میں جو کچھ کہا اور لکھا گیا وہ بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بنا۔ بہت سے مغربی مصنفین نے اس بارے میں اسلام کے موقف کو غلط سمجھا۔ بعض لوگوں نے دانستہ یا نادانستہ اس کو غلط انداز میں پیش کیا اور کچھ مخالفین نے لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کیلئے جنگی قیدیوں سے متعلق اسلام کے بعض احکام کو منفی رنگ میں پیش کیا۔

قرآن پاک میں جنگی قیدیوں کے بارے میں بہت سے احکام دئے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت میں جنگی قیدیوں کے

بارے میں بڑی مفصل ہدایات عطا فرمائی ہیں۔خلفائے راشدین اور بعد کے ادوار میں مسلم فرمانرواؤں کے طرز عمل سے بہت سے دوسرے سوالات کا جواب ملتا ہے ان تمام احکام وہدایات کی تہہ میں جو اصول کارفرما ہے ہیں ان کو دو بنیادی عنوانات کے تحت سمیٹا جاسکتا ہے۔

﴿1﴾ سب سے بنیادی تقاضا تو وہ ہے جس کا اس گفتگو کے آغاز میں ذکر کیا گیا یعنی خود اسلام کا نظریہ اور عقیدہ کہ کسی اقدام، پالیسی یا طرز عمل سے اسلام کے نظریہ پر کیا اثر پڑتا ہے، کوئی شخص نظریہ اسلام سے کتنا قریب آتا ہے اور کتنا دور ہوتا ہے۔اسلام میں یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ مسلمانوں کے کسی رویہ یا طرز عمل سے دوسرے لوگ اسلام سے قریب ہوتے ہیں یا دور ہو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت میں کوئی ایسا عمل یا اقدام کسی مسلمان حکمران کیلئے جائز قرار نہیں دیا گیا جس کے رد عمل کے طور پر لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں۔یہاں تک کہ جائز اور مستحب امور میں بھی اس امر کی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا کہ اسکے نتیجہ میں اسلام کے بارے میں لوگوں کا رویہ کیا ہوگا۔اگر اس بات کا ظن غالب ہو کہ کسی مستحب پر اصرار کرنے کے نتیجہ میں اسلام کا کوئی فرض یا واجب مجروح یا متاثر ہوگا تو اس مستحب پر عمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔اسی طرح یہ مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک فرض یا واجب کو اس لئے ملتوی کر دیا گیا کہ اس کے رد عمل کے طور پر لوگوں کے اسلام سے برگشتہ ہو جانے کا خطرہ موجود تھا۔علی ہذا القیاس ایسے تمام امور اور اقدامات پسندیدہ قرار دئے گئے جن کے نتیجہ میں مسلمان اسلام پر زیادہ مضبوطی سے کاربند ہو جائیں اور غیر مسلم اسلام کے قریب آجائیں۔یہ بنیادی تقاضا جنگی قیدیوں کے احکام میں بھی پیش نظر رکھا گیا اور اس کی کوشش کی گئی کہ جنگی قیدیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسلام کے قریب لایا جائے، کوشش کی گئی کہ وہ اسلامی معاشرہ میں برابری کی سطح پر رچ بس جائیں اور یوں ان کے ذریعہ ان کے اپنے علاقوں اور لوگوں میں کام کرنے کیلئے اسلام کو کارکن میسر آجائیں۔

﴿2﴾ جنگی قیدیوں کے بارے میں دوسری اہم بات جو پیش نظر رہی ہے وہ اسلامی معاشرہ کی اخلاقی ساخت کا تحفظ ہے۔اسلامی معاشرہ بنیادی طور پر ایک اخلاقی معاشرہ ہے۔اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں میں مسلم معاشرہ کی اخلاقی ساخت اور اسلامی اخلاقی اقدار و تعلیمات کا تحفظ اور ان کی توسیع وتقویت بھی شامل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں وہ تمام اقدامات ناجائز قرار دئے گئے ہیں جن سے معاشرہ کی اخلاقی قدروں پر منفی اثرات پڑتے ہوں اور وہ تمام اقدامات ضروری تصور کئے گئے ہیں جو اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی نشر واشاعت اور اخلاقی اقدار کی آبیاری میں معاون ثابت ہوتے ہوں۔اس اصول کے پیش نظر جنگی قیدیوں کے بارے میں اسلام کی تعلیمات کا مطمح النظر یہ بھی رہا کہ ان کی موجودگی سے معاشرہ میں نہ اخلاقی قباحتیں جنم لیں اور نہ ثقافتی مسائل پیدا ہوں علم الاجتماع کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ بڑی تعداد میں انتقال آبادی سے کیا کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں۔جن لوگوں کی نظریں اقوام کے عروج وزوال پر رہتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب کبھی بڑے پیمانہ پر ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال آبادی ہوتا ہے تو اس سے کیسے کیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔اخلاقیات کی عمارت کس طرح پہلے کمزور اور پھر منہدم ہوتی ہے اور معاشرتی اقدار کس طرح ٹوٹی پھوٹتی ہیں۔

اسلام نے جنگی قیدیوں کے گھمبیر مسائل کو حل کرنے میں دیگر زمینی حقائق کے ساتھ ساتھ ان امور کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔اسلام کا

مزاج غیر حقیقی نکتہ آفرینوں اور دنیائے واقعات سے ماوراء نعرہ بازیوں کا نہیں ہے۔ اسلامی قانون جنگ میں اس حقیقت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اگر جنگی قیدیوں کی بڑی تعداد کو کسی طے شدہ منصوبہ اور بلا کسی دوررس سنجیدہ غور وفکر کے کسی آبادی میں ویسے ہی چھوڑ دیا جائے بالخصوص خواتین قیدیوں کو۔ تو اس سے کس قدر خوفناک ہولناک اور تباہ کن معاشرتی، اخلاقی اور معاشی خرابیاں جنم لیں گی اسلام نے ان تمام ممکنہ نتائج وتضمنات کو مدنظر رکھا ہے اور انکا حتی الامکان سدباب کیا ہے ۔

یہ ہیں وہ بڑے موضوعات جن پر اسلام کے قانون بین الممالک یا علم سیر میں بحث کی جاتی ہے اور یہ ہے ان موضوعات کی اسلام کے عمومی نظام میں اہمیت۔ جیسا کہ فقہ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ اسلام کا قانون بین الاقوام ''سیر'' فقہ اسلامی کے آٹھ اہم اور بڑے بڑے ابواب (عبادات، مناکحات، الحظر والاباحه، جنایات، ادب القاضی، الاحکام السلطانیه ، اور سیر) میں سے ایک اہم باب ہے۔ اسلام کا عمومی ضابطہ حیات جو انسانی زندگی کے تمام ظاہری اعمال سے بحث کرتا ہے، یعنی ''علم فقہ'' جن مآخذ و مصادر سے ماخوذ ہے انہی مصادر ومآخذ سے علم سیر بھی ماخوذ ہے بالفاظ دیگر مصادر ومآخذ کے اعتبار سے فقہ اسلامی کے مختلف ابواب میں کوئی فرق نہیں ہے سب ایک ہی سرچشمہ نور وہدایت سے مستنیر ہیں۔

اسلام کا قانون بین الممالک کے مأخذ ومصادر شرع :

عموماً اصول فقہ کی کتابوں میں جن 4 مصادر فقہ (فقہائے کرام کی اصطلاح میں ادلہ شرعیہ) کا ذکر ہوتا ہے وہ قرآن مجید، سنت رسول ﷺ، اجماع امت اور فقہائے کرام کا اجتہاد اور قیاس ہیں۔ قرآن مجید میں قانون جنگ وصلح، بین الاقوامی لین دین، انسانی جان کے احترام، جنگ کی جائز صورتوں، دفاع ملک وملت، معاہدہ جات وغیرہ کے بارے میں بنیادی ہدایات دے دی گئیں جن سے فقہائے اسلام نے اسلام کے قانون بین الممالک کے اساسی اصول دریافت کئے۔ یوں تو قرآن مجید کی تمام سورتوں اور اجزاء میں جا بجا ایسے اصول بکھرے ہوئے ہیں تاہم سورۃ بقرہ، سورۃ نساء، سورۃ مائدہ، سورۃ انفال، سورۃ توبہ اور سورۃ محمد میں خاص طور پر قانون جنگ وصلح کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ سورۃ انفال اور سورۃ توبہ تو ان سورتوں میں بھی خاص امتیاز رکھتی ہیں اور اسلام کے قانون بین الاقوامی کا سب سے بڑا مصدر وماخذ ہیں۔

فقہ اسلامی کا دوسرا بنیادی ماخذ سنت رسول ﷺ ہے۔ سنت رسول میں بین الاقوامی تعلقات کے احکام کی مختلف جہتوں کو منظم کیا گیا اور قرآن پاک کے جملہ احکامات وہدایات کے مفصل عملی نظائر پیش کئے گئے دوران جنگ مجاہدین اسلام کے طرز عمل سے لے کر بین الاقوامی معاہدات امن اور بین الاقوامی سفارت وتجارت کے احکام سنت ہی کے ذریعہ دئے گئے بین الاقوامی نوعیت کے احکام اور معاہدہ جات کا ذکر مکہ ہی میں سننے میں آنے لگا تھا۔ ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ نے عقبہ کے مقام پر انصار مدینہ سے جو معاہدے کئے ان کے مندرجات پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ وہ بین الاقوامی نوعیت ہی کے معاہدے تھے بلکہ اسلام سے بھی قبل اپنی نوجوانی میں حضور ﷺ نے حلف الفضول نامی جس معاہدہ میں شرکت فرمائی تھی اور نبوت کے بعد بھی جس کی توثیق فرمائی وہ ایک خالصتاً

بین الاقوامی نوعیت اور مقاصد کا معاہدہ تھا۔ان معاہدوں سے بین الاقوامی مقاصد کے حصول کی کاوشوں میں شرکت کی عملی رہنمائی ملتی ہے۔

پھر ہجرت مدینہ کے فوراً بعد سرکار دو عالم ﷺ نے پے در پے بہت سے عرب قبائل سے دوستی اور عدم جنگ کے معاہدے کئے، قریش مکہ نے ہجرت کے چند ماہ بعد ہی سے مدینہ کے خلاف جن جنگی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا ان کا بھرپور جواب دیا گیا اور ایسے ہر اقدام نے بہت سے اصول واحکام عطا کئے۔غزوہ بدر کے نتیجہ میں جنگی قیدیوں کا مسئلہ آیا تو جہاں قرآن میں ان کے بارے میں عمومی ہدایات نازل ہوئیں وہاں سنت میں تفصیلی احکام اور عملی نظائر دئے گئے۔

غزوہ احزاب کے بعد جزیرہ عرب سے بہار اسلام کے روابط کا آغاز ہوا اور مزید بین الاقوامی نوعیت کی جہتیں سامنے آئیں جن کے بارے میں سنت میں مزید ہدایات دی گئیں۔قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کی یہی وہ بنیادی ہدایات تھیں جن کی اساس پر فقہائے اسلام نے دوسری صدی ہجری میں علم سیر کے نام سے تاریخ کا پہلا قانون بین الممالک مرتب کیا۔

سنت میں بیشتر فقہاء اور محدثین کے نزدیک تعامل صحابہ، سنت صحابہ اور آثار صحابہ بھی شامل ہیں۔بعض محدثین وفقہاء نے تعامل تابعین ،سنت تابعین اور آثار تابعین کو بھی سنت میں شمار کیا ہے مورخین حدیث اور مصنفین علوم حدیث نے اس پر بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں کہ آیا صحابہ کرام اور تابعین کا تعامل، طرز عمل اور آثار تابعین کو بھی سنت میں شمار کیا ہے؟ مورخین حدیث اور مصنفین علوم حدیث نے اس پر بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں کہ آیا صحابہ کرام اور تابعین کا تعامل، طرز عمل اور آثار واقوال بھی اصطلاحی طور پر سنت قرار دی جاسکتے ہیں یا نہیں اور اگر ان کو سنت قرار دیا جاسکتا ہے تو کس حد تک اور کن حالات وشرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے۔تاہم اس امر میں کسی کو اختلاف نہیں کہ خیر القرون اور سلف صالحین کے ان ائمۃ الہدی کے اقوال واجتہادات اور فیصلے اسلامی قانون کا ایک اہم ماخذ اور بعد والوں کیلئے ایک انتہائی وقیع اور قابل احترام نظیر ہیں۔فنی اعتبار سے صحابہؓ وتابعینؒ کے اجتماعی طرز عمل کو سنت قرار دیا جائے یا اجماع امت اور ان کی انفرادی آراء واجتہادات کو سنت کی ایک فرع سمجھا جائے یا اجتہاد وقیاس کی ایک (لیکن اعلیٰ وبرتر) قسم، اس بحث سے قطع نظر یہ بات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ صحابہؓ وتابعینؒ کے نظائر نے جہاں اسلامی قانون کے دوسرے شعبوں کو گوناگوں تصورات سے مالا مال کیا ہے وہاں اسلام کا قانون بین الممالک بھی اس بے بہا ذخیرہ سے محروم نہیں رہا۔

صحابہ وتابعین اور کسی حد تک تبع تابعین کے فیصلوں، تعامل اور طرز عمل نے اسلام کے قانون بین الممالک کو بہت سے اصول دئے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے دور کی متعدد نظیریں بعد میں بہت سے احکام کی اساس قرار پائیں۔بیرون ملک سے آنے والے تاجروں پر دس فیصد کے حساب سے کسٹم ڈیوٹی پہلی بار حضرت عمر فاروقؓ کے احکام پر لگائی گئی۔سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے طرز عمل سے فقہائے اسلام نے باغیوں کے احکام کا استنباط کیا۔خوارج کے ساتھ سیدنا علیؓ کا رویہ اسلامی قانون بین الاقوامی کے اس حصہ کی بنیاد بنا جو باغیوں کے احکام سے بحث کرتا ہے۔صدر اسلام میں حدیث اور فقہ کے دور تدوین میں لکھی گئی فقہ اور حدیث کی کتابوں بالخصوص عبدالرزاق، ابن ھمام، ابوبکر بن ابی شیبہ اور ابن حزم کی تصنیفات میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے اقوال واجتہادات کے ذخیرے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

تعامل صحابہؓ وتابعینؒ کی طرح تعامل خلفاء وامراء سے بھی فقہائے اسلام نے بہت سے اصولوں کا استنباط کیا اور متعدد خلفاء اور امراء کے فیصلوں کی بنیاد پر بھی فقہی احکام مرتب کئے۔ خلفائے راشدین کی سنت اور فیصلے تو بہرحال حدیث نبوی اور سنت کے جزء تھے ہی، بعد کے خلفائے اور امراء کے فیصلے بھی متعدد احکام کی بنیاد بنے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں امیر المومنین مروان بن الحکمؒ اور ان کے صاحبزادے امیر المومنین عبدالملک بن مروانؒ کے بعض فیصلوں کو سنت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ دیگر فقہائے کرام نے بھی بعد کے متعدد خلفاء اور امراء کے فیصلوں اور نظائر کو اپنے اجتہاد کی بنیاد بنایا۔

قرآن وسنت کے بعد اجماع واجتہاد 2 ایسے اہم ترین مصادر ہیں جن کی بنیاد پر فقہ اسلامی کے بیشتر احکام مرتب ہوئے ہیں

اجماع اور اجتہاد سے استنباط قوانین بین المما لک :

اسلام کے قانون بین المما لک کے متعدد ایسے بنیادی اصول ہیں جو صدر اسلام میں اجماع سے طے ہوئے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں ہندومت اور بدھ مت کے پیروکاروں کے معاملہ میں اسلامی ریاست کا طرزعمل کیا ہونا چاہئے یہ مسئلہ پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی میں فتح سندھ وملتان کے فوراً بعد سامنے آیا اور اس دور کے فقہائے اسلام نے بالا تفاق یہ فیصلہ کیا کہ ان لوگوں سے مسلمانوں کے تعلق کی نوعیت وہ ہوگی جو حدیث میں فارس کے آتش پرستوں کیلئے بتائی گئی ہے۔ یعنی وہ اسلامی ریاست کے آزاد اور ذمہ دار شہری ہوسکتے ہیں اور ان تمام مراعات سے فیضیاب ہوسکتے ہیں جو اہل کتاب کو حاصل ہیں، البتہ انکی عورتوں سے شادی بیاہ نہیں ہو سکے گا اور انکا ذبیحہ مسلمان نہیں کھاسکیں گے اجماع واجتہاد کی بنیاد پر بین الاقوامی معاملات کے بہت سے اصول طے کئے گئے جن کو سامنے رکھ کر بعد میں فقہائے اسلام نے مزید تفصیلی احکام مرتب کئے۔

اسلام کا اصول مجازات :

یہ چار تو وہ بنیادی مصادر وماٰخذ تھے جن سے اسلام کے جملہ احکام بشمول قانون بین المما لک کے احکام ماخوذ ہیں۔ لیکن ان چار کے علاوہ بعض اصول اور بھی ہیں جو اصلاتو قرآن وسنت ہی میں مذکور ہیں لیکن فقہائے اسلام نے ان سے بہت سے دوسرے احکام بھی اخذ کئے ہیں۔ ان اصولوں میں سے ایک اہم اصول مجازات بھی ہے قرآن پاک کی ایک آیت ہے جو بین الاقوامی تعلقات کے سیاق وسباق میں بیان ہوئی ہے۔ سورہ بقرہ میں جہاں جنگ ومصالحت کا ذکر ہے وہاں ارشاد ہوا۔ " فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم '' یعنی اگر کوئی قوم تمہارے خلاف زیادتی کرتی ہے تو تم اتنی ہی زیادتی اس پر کرسکتے ہو جتنی اس نے تم پر کی ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے وجزاء سیئة سیئة مثلها یعنی اگر کوئی تمہارے خلاف اقدام کرتا ہے تو تم اسکے خلاف ویسا ہی اقدام کرسکتے ہو۔ ایک اور جگہ فرمایا والحرمات قصاص کوئی تمہارے احترام میں کمی کرے یا تمہاری کسی مقدس ومحترم چیز کو ٹھیس پہنچائے تو تم بھی اسکے خلاف ویسا ہی اقدام کرسکتے ہو، یعنی بدلہ لے سکتے ہو۔

اس طرح کی آیات سے فقہاء نے جو اصول نکالا ہے وہ مجازات کہلاتا ہے جو اسلام کے قانون بین الاقوام کی ایک بہت بڑی بنیاد بلکہ خود ماخذ قانون ہے۔ اگر دنیا میں کوئی غیر مسلم قوم مسلمانوں سے خاص انداز کا تعلق رکھتی ہو تو اسی انداز سے مسلمان اس سے تعلق رکھ سکتے ہیں۔

کسٹم ڈیوٹی قانونی مجازات کا ایک عملی مثال :

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں اسلامی حکومت کو اطلاع ملی کہ ایرانی سلطنت مسلمان تاجروں سے دس فیصد کسٹم ڈیوٹی یا ٹیکس وصول کرتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ان کا کوئی تاجر مسلمان ریاست میں داخل ہوگا تو ہم بھی اس سے دس فیصد ٹیکس وصول کریں گے یعنی کسٹم ڈیوٹی، یہ مجازات کے قانون پر عملدرآمد کی ایک مثال تھی۔ اسی اصول پر حضرت عمر فاروقؓ نے یہ حکم وضع کیا جس سے استدلال کر کے فقہاء نے بہت سے دوسرے اصول اخذ کئے۔

اسی طرح بعد کے مسلمان حکمرانوں کا تعامل اور ان کا عمومی طرز عمل اسلام کے قانون بین الاقوام کے تفصیلی احکام کیلئے اہم بڑی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ عام طور پر فقہاء اسلام کا اصول یہ ہے کہ وہ بعد کے مسلمان حکمرانوں کے طرز عمل کو کسی باقاعدہ قانونی ماخذ کی حیثیت نہیں دیتے اسلئے کہ اسلام کے اصول وقواعد کی رو سے صرف سرکار دو عالم ﷺ کا طرز عمل ہی ماخذ قانون ہے یا پھر آگے صحابہ کا عمومی طرز عمل ہے جس کو ماخذ قانون کی حیثیت سے قبول کیا گیا۔ صحابہ کرام کے عمومی طرز عمل کے علاوہ کسی مسلمان فرد کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس کے قول وفعل یا عمل کو نمونہ قرار دے کر اس کی پیروی کی جائے اور اس کی بنیاد پر اصول مستنبط کئے جائیں۔ لیکن چونکہ مجازات کا اصول خود قرآن پاک نے دیا ہے اسلئے مجازات کا قانون دونوں طرف سے کام کرتا ہے۔ ایک غیر مسلم ملک یا غیر مسلم حکمران ایک طرز عمل اختیار کرتا ہے، اس کے مقابلے میں ہم بھی اسلام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ویسا ہی یا وہی طرز عمل اختیار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک مسلم حکمران ایک طرز عمل اختیار کرتا ہے اور اسکے مقابلے میں ایک غیر مسلم حکومت ویسا طرز عمل اختیار کرتی ہے اس طرح سے ایک نظیر قائم ہو جاتی ہے وہ نظیر آگے چل کر ایک کلیہ بن جاتی ہے۔ اس کلیہ پر مسلمان بھی عمل کرتے ہیں اور غیر مسلم بھی عمل کرتے ہیں۔ پھر یہ کلیہ اسلام کے قانون بین الاقوام کا ایک ماخذ اور مصدر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے کہیں کہیں بعد کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کے طرز عمل کو بھی بین الاقوامی تعلقات میں بطور مثال پیش کیا ہے۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ امام مالکؒ نے عبدالملک بن مروان کے طرز عمل کو سنت کی دلیل قرار دیا، اسی طرح امام اوزاعیؒ نے منصور کے طرز عمل کو بطور مثال پیش کیا۔ بعد کے فقہائے اسلام نے بھی وقتاً فوقتاً مختلف دوسرے مسلم فرمانرواؤں کے ایسے اقدامات کو بھی جو شریعت سے متعارض نہیں تھے۔ قبول کیا اور ان کو ایک ایسی بنیاد قرار دیا جس پر اسلام کا بین الاقوامی قانون کے نئے قانونی اصول اور تصورات وضع کر سکتا ہے اور نئے قواعد مرتب کر سکتا ہے۔

اسلام کا قانون بین الاقوام میں عرف ورواج کے کردار :

اسلام کے بین الاقوامی قانون کا ایک ماخذ عرف بھی ہے، یعنی بین الاقوامی یا علاقائی رواج جو آج بین الاقوامی قانون کا اولین ماخذ مانا جاتا ہے۔ عرف اور رواج کو اسلام نے بھی تسلیم کیا اور اسلام کے قانون بین الاقوام نے بھی تسلیم کیا آج انٹرنیشنل کسٹم پوری دنیا کے

بین الاقوامی قانون کا سب سے بڑا ماخذ مانا جاتا ہے۔آج یہ چیز بین الاقوامی قانون کا سب سے اولین ماخذ بھی ہے اور سب سے بڑا ماخذ بھی ہے۔لیکن فقہاء اسلام نے نہ اس کو اولین ماخذ تسلیم کیا اور نہ سب سے بڑا ماخذ مانا۔اولین ماخذ قرآن مجید اور سرکار دو عالم ﷺ کی سنت ہے۔ان دونوں کے بعد اجماع، قیاس اور اجتہاد کا درجہ ہے۔پھر مجازات اور مسلم فرمانرواؤں کا طرز عمل ہے۔اس کے بعد آخر میں کہیں جا کر عرف کا نمبر آتا ہے۔

عرف کے اصول کو قرآن پاک نے تسلیم کیا ہے ارشاد ہوتا ہے **خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلين** (سورہ اعراف) معافی کا رویہ اپناؤ، عرف کے مطابق چلنے کے حکم دو اور جاہلوں سے صَرفِ نظر کرو۔عرف کے علاوہ معروف کا قرآن پاک نے بار بار ذکر کیا ہے، یعنی ایسا طرز عمل یا رواج جو اسلام کے تصور سے متعارض نہ ہو اور اسلام کے فلسفے سے ہم آہنگ ہو اور جس سے اسلام کے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہو۔ان شرائط کے ساتھ عرف اور معروف کو اسلام نے تسلیم کیا ہے اور اس کو ایک جائز ماخذ قانون گردانا ہے۔ عرف اور معروف کے اس اصول کی بنیاد پر بہت سے احکام فقہائے اسلام نے ماضی میں مرتب کئے اور آج بھی مرتب کئے جاسکتے ہیں۔

مسلمان ریاستوں کی داخلی سازی :

ایک اور ماخذ قانون بین الاقوام کے تعلقات کے باب میں مسلمان ریاستوں کی داخلی قانون سازی بھی ہے۔آج بھی مغربی قانون بین الاقوام داخلی قانون سازی کو بین الاقوامی قانون کا ایک جائز ماخذ مانتا ہے۔اسلام بھی اس کی تصدیق کرتا ہے خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے جانشینوں یا عام مسلمانوں کو بعض ہدایات دیں لیکن اس کے تضمنات اور نتائج غیروں سے تعلقات میں ظاہر ہوئے مثلاً سیرت پاک کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ حضور ﷺ نے بستر مرگ پر آخری لمحات میں مسلمانوں کو جو ہدایات جاری فرمائی تھیں ان میں سے ایک ہدایت بین الاقوامی قانون اور تعلقات کی نوعیت کی بھی تھی آپ ﷺ نے فرمایا تھا **اخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب** کہ جزیرہ عرب سے یہودیوں اور عیسائیوں کو باہر نکال دینا چونکہ یہ علاقہ اب اسلام کا مرکز قرار دے دیا گیا ہے اور اب یہ علاقہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اسلام کا روحانی دارالحکومت ہوگا لہذا اب یہاں صرف اور صرف نظریہ اسلام کو رہنے کی اجازت ہوگی اور باقی نظریات و مذاہب کے ماننے والوں کے سامنے اب صرف دو پُرامن راستے ہیں۔یا تو اپنی آزاد مرضی سے اسلام قبول کرلیں یا جزیرہ عرب سے نکل کر کسی اور جگہ جا کر آباد ہو جائیں۔ان اسباب کی بناء پر یہ حکم دیا گیا کہ آئندہ جزیرہ عرب میں کوئی غیر اسلامی نظریاتی طاقت موجود نہ ہونی چاہئے بلکہ یہاں خالص اسلامی عقیدے کی پاسداری اور حکمرانی ہونی چاہئے۔اسلئے یہاں غیر مسلموں کے آباد ہونے کو روکا گیا۔یہ خیال نہ فرمایئے کہ ایسا کسی تعصب یا غیر مسلموں سے نفرت کی بنیاد پر کیا گیا۔واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے کئی نظاموں میں آج بھی اسطرح کا تصور موجود ہے۔اگر آپ روم تشریف لے گئے تو آپ نے وہاں شہر روما کا ایک بہت بڑا اور مشہور تاریخی محلّہ ضرور دیکھا ہوگا جو ''ویٹیکن'' کے نام سے مشہور ہے۔جہاں رومن کیتھولک عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز ہے یہاں پاپائے اعظم رہتا ہے۔وہاں غیر کیتھولک کو جائیداد خریدنے اور مستقل آباد ہونے کی اجازت نہیں ہے اسلئے وہ اس کو اپنے دین کا مرکز بنانا چاہتے ہیں اس طرح کی اور

مثالیں بھی موجود ہیں۔ ماضی میں بھی موجود تھیں اور آج بھی موجود ہیں۔ اسی نوعیت کی ایک مثال یہ ہے کہ جزیرہ عرب میں غیر مسلموں کو مستقل طور پر آباد ہونے سے سرکار دو عالم ﷺ نے روکا ہے۔ یہ ایک داخلی قانون سازی کی ایک مثال ہے جس کے بین الاقوامی تضمنات ہیں۔

یہ ہیں بنیادی طور پر اس بین الاقوامی قانون کے مآخذ اور مصادر جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اس قانون کا ایک بنیادی وصف اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک عمومی اور ہمہ گیر قانونی اسکیم کا ایک حصہ ہے۔ یہ کوئی خودرو ارتقاء نہیں ہے، بلکہ ایک مضبوط سکیم اور نظریہ کی بنیاد پر اس کا ارتقاء ہوا ہے۔ اس جامع اسکیم کا جزو ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں وہ توازن اور اعتدال موجود ہے جو دنیا کے دوسرے بین الاقوامی نظاموں میں موجود نہیں ہے۔ اس توازن اور اعتدال کی مثالیں بیان کی جائیں تو گفتگو بہت طویل ہو جائے گی۔

لیکن ایک بات یہاں عرض دینا مناسب ہے کہ اوپر اسلامی قانون بین الممالک کے جو اہم ابواب بیان کئے گئے ان میں بعض ایسے کلیات کارفرما ہیں جن کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کلیات ان سب ابواب کے مسائل و معاملات کو افقی طور پر بھی حل کر سکتے ہیں اور عمودی طور پر بھی حل کر سکتے ہیں گویا یہ کلیات فقہ اسلامی کے کسی ایک باب ہی کے احکام و مسائل کو نہیں بلکہ تمام ابواب کے مسائل و احکام کو مرتب کر سکتے ہیں۔ اسلئے کہ ان کلیات میں وہ فکر بیان کی گئی ہے جو فقہ اسلامی کے احکام میں پیش نظر رکھی جاتی ہے۔ اسلئے کہ جو بنیادی فلسفہ اور تصور عبادات میں کارفرما ہے وہی فلسفہ اور تصور بین الاقوامی تعلقات میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

اسلامی قانون انسانی زندگی کے تعلقات کو عمومی اعتبار سے سامنے رکھتا ہے :

مثال کے طور پر اسلامی فقہ کا ایک اصول ہے کہ جہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مابین تعارض ہو وہاں حقوق العباد کو ترجیح دی جائیگی۔ یہ شریعت کا ایک بنیادی قاعدہ ہے کہ جہاں ایک طرف اللہ کا حق ہو اور دوسری طرف بندے کا حق ہو اور آپ ایسی صورت حال میں ہوں کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی کو ادا کر سکتے ہوں تو آپ کیلئے حکم یہ ہے کہ بندے کے حق کو ادا کریں اور اللہ کے حق کو فی الحال ملتوی کر دیں۔ ہدایہ میں جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے کتاب الحج میں لکھا ہے ''حق العبد مقدم علی حق الشرع بامرہ'' یعنی شریعت کا حکم یہ ہے کہ جہاں تعارض ہو وہاں بندے کے حق کو مقدم رکھا جائے، اللہ اور شریعت کے حق کو موخر کیا جائے۔ اسلئے کہ بندہ محتاج، کمزور اور ضرورت مند ہے۔ اللہ تعالی محتاج نہیں ہے اور نہ اس کی شریعت کسی کی ضرورتمند ہے۔ یہ اصول عبادات میں بھی موجود ہے اور بین الاقوامی تعلقات میں بھی۔ اس طرح ایک ایسا توازن، وحدت اور یک جہتی قائم ہو جاتی ہے جو اسلامی قانون کے تمام ابواب میں نظر آتی ہے اور یوں ایک متوازن، جامع اور بہترین نظام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایسا نظام جو کسی ایک پہلو کی بجائے تمام شعبہ جات زندگی سے بحث کرتا ہے، اسلامی قانون دیگر نظاموں کی طرح ایسا یک رخا نہیں کہ ایک پہلو کو سامنے رکھ کر دیگر تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دے بلکہ یہ انسانی زندگی کے تعلقات کو عمومی اعتبار سے سامنے رکھتا ہے۔

اسلام کا قانون بین الانسانی قانون ہے :

دوسرا واضح نتیجہ اس بحث سے یہ سامنے آتا ہے کہ اسلام کا بین الاقوامی قانون صحیح معنوں میں ایک انسانی قانون ہے جو دنیا کے سارے انسانوں کو، دنیا کے ہر علاقے اور ہر قسم کے انسانوں کو، ایک لڑی میں پرونے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قانون میں انسانوں کے معاملات کو منضبط کرنے کیلئے جو ہدایات دی گئی ہیں اور جو طرز عمل اور رویہ اختیار کیا گیا ہے وہ ان کے رنگ، نسل ، زبان اور علاقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ نظریے اور عقیدے کی بنیاد پر ہے یہ وہ چیز ہے جو ہر انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ انسان کو اللہ نے ایک مکلف مخلوق بنایا ہے جس کو ارادے اور مشیت سے نوازا ہے۔ جسکے پاس فیصلہ کرنے کی قوت موجود ہے ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر معقول اور ذمہ دار انسانوں کا بھی یہی طرز عمل ہے کہ جب وہ کسی دوسرے انسان سے معاملہ کرتے ہیں تو اسکے آزادانہ فیصلے کی بنیاد پر اس سے معاملہ کرتے ہیں۔ خود آپ جب ایک شخص سے خرید وفروخت کرتے ہیں یا کوئی کاروبار کرتے ہیں تو آپ اس سے جو رویہ کی توقع اور مطالبہ کرتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جو اس نے اپنے آزاد مرضی سے کیا ہو۔ اس نے اپنی کوئی جائیداد فروخت کی ہو، اپنی کوئی چیز آپ کو ہدیہ کے طور پر دی ہو یا آزاد مرضی اور رضامندی سے آپ کو نقصان پہنچایا ہو تو آپ اس سے تاوان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ غیر ارادی طور پر خود بخود کوئی چیز کسی سے سرزد ہوگئی ہو تو کوئی شریف انسان چاہے وہ کسی بھی نظام قانون پر کاربند ہو دوسرے انسان کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا۔ مثلاً ایک چھوٹا بچہ جو ابھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا اور معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس کے کسی عمل پر آپ اسکے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کرتے۔ اسلئے کہ اس میں اسکی اپنی مشیت اور ارادہ کو دخل نہیں ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ اگر اسلام انسانوں سے ان کے نظریئے اور عقائد کی بنیاد پر معاملہ کرتا ہے اور رنگ اور نسل کی بنیاد پر نہیں کرتا تو یہ اسی فطری انسانی اصول کے مطابق ہے۔ فطری اصول یہ ہے کہ انسان کے اپنے ارادہ اور اختیار کی بنیاد پر اس سے معاملہ کیا جائے محض بخت واتفاق پر نہ کیا جائے۔ رنگ اور نسل محض ایک اتفاق ہے، کوئی خود طے کر کے گورا یا کالا پیدا نہیں ہوتا، کوئی خود طے کر کے کسی خاص نسل میں پیدا نہیں ہوتا۔ اسلئے اس اتفاق کی بنیاد پر کوئی معاملہ کرنا انسانی مزاج اور فطرت کے خلاف ہے اسلئے قرآن پاک میں معاملے کی بنیاد ان چیزوں کو قرار نہیں دیا گیا بلکہ ایک انسان اپنے آزادانہ فیصلہ سے جو کچھ کہتا ہے یا کرتا ہے اسی کی بنیاد پر اس سے معاملہ کیا جاتا ہے۔ چونکہ اسلام کا قانون اصلاً ایک بین الانسانی قانون ہے اس لئے یہ انسانی عقل وشعور کی بنیاد پر ہی انسانوں سے معاملات کرتا ہے۔

اسلام کا قانون بین الممالک کثیر العناصر معاشرے کا خواہاں ہے :

آج کل دنیا میں بڑا چرچا ہے خاص طور پر مغرب میں کہ ایک کثیر العناصر یعنی ''پلورسٹک'' معاشرہ کیسے وجود میں لایا جائے۔ یعنی ایک ایسا انسانی معاشرہ کیسے وجود میں لایا جائے جس میں تمام رنگوں، نسلوں، اور عقیدوں کے انسان عزت سے زندگی گزار سکیں۔ بعض معاشرے بڑے یک عنصری معاشرے ہوتے ہیں جن میں ایک ہی قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ لیکن ماضی میں ایسا آسانی سے ہوسکتا

تھا کہ کسی معاشرہ میں ایک ہی رنگ، نسل یا زبان کے لوگ بس سکیں اور دوسروں کو وہاں بسنے کی اجازت نہ ہو۔ لیکن آج ایسا نہیں ہوسکتا۔ آج دنیا کا ہر بڑا شہر ایک کثیر العناصر شہر ہے جہاں دنیا سے ہر قسم کے لوگ آکر بستے ہیں۔ دنیا بھر کی ثقافتیں اور تہذیبیں بڑے بڑے شہروں میں آکر مل گئیں ہیں۔ دنیا بھر کے عقائد ونظریات ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ آج دنیا کا ہر بڑا شہر اسی طرح کا کثیر العناصر شہر ہے۔ ایسے ماحول میں جو آئندہ بڑھتا اور پھیلتا ہی جائیگا اور جس میں ہر بڑا شہر زیادہ سے زیادہ کثیر العناصر ہوتا چلا جائیگا اس ماحول میں کوئی یک عنصری نظام نہ چل سکتا ہے اور نہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس صورت حال میں تو وہی نظام کامیاب ہوسکتا ہے جو کثیر العناصر ہو۔ یہ نظام صرف اسلام کا بین الاقوامی قانون ہی فراہم کرسکتا ہے۔ جس میں دنیا کے سارے انسانوں کی ضروریات کا سامان موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے بین الاقوامی قوانین جو مختلف اقوام میں پیدا ہوئے، ان میں ایک ایسا ناقابل تبدیل اندرونی تصور موجود ہے جو ان کو کثیر العناصر بننے سے روکتا ہے یہ نظام اور قوانین کسی کثیر العناصر یا پلورسٹک معاشرہ کو خوش دلی کے ساتھ آگے نہیں بڑھا سکتے ان میں ایسی جکڑ بندیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ ترقی نہیں کرسکتا۔ جو نظام ایک خاص رنگ کے لوگوں کو بالا دست مانتا ہو اور جہاں لوگوں میں اندر سے یہ تعصب پیدا ہوگیا ہو کہ فلاں علاقے کے لوگ دنیا پر حکومت کرنے کیلئے پیدا ہوئے ہیں وہاں ایک کثیر العناصر انسانی معاشرہ قائم کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ارسطو بہت بڑا فلسفی ہے جس کی فلسفیانہ کاوشوں کے سامنے دنیا نے سر اعتراف خم کیا ہے مشرق ومغرب نے اس کی عقلی وفکری امامت کا اعتراف کیا ہے وہ بھی ان تعصّبات سے بالاتر نہیں ہوسکا۔ وہ کہتا ہے کہ غیر یونانیوں کو فطرت نے یونانیوں کی غلامی کیلئے پیدا کیا ہے۔ پھر افلاطون کو دیکھئے جو دنیا کی تاریخ کا نامور حکیم اور فلسفی ہے جس کو بعض مسلمانوں نے افلاطوں الٰہی کہا ہے۔ جس کی کتاب جمہور یہ ہر دور میں ایک مثالی ریاست کا ایک بڑا نمونہ سمجھی گئی۔ اس نے بھی اپنے مثالی نظام میں کچھ لوگوں کو مستقل غلامی کیلئے لازمی قرار دیا۔

یورپ کا موجودہ نظام جسکی اصل فکری بنیاد یونانیوں کے تصورات پر قائم ہیں۔ پھر جس پر رومیوں کے مادہ پرستانہ تصورات اور شہنشاہیت زدہ اداروں نے بڑا گہرا اثر ڈالا اور پھر بالآخر جس کو قرون وسطی کی مسیحیت سے ایک نئی روح اور زندگی ملی۔ آج وہ نظام ہمارے سامنے ہے یہ سارے عناصر اس نظام کی تشکیل کرتے ہیں اسلئے اس نظام کیلئے یہ بڑا مشکل ہے کہ وہ جائز طور پر تمام انسانوں کو اپنا حق مساوات کے طور پر دے دے اور پھر کوئی متوازن نظام دنیا کے سامنے پیش کرے۔ یہ شاید ان کیلئے فکری، نفسیاتی اور جذباتی طور پر ایک دشوار عمل ہے یہی وجہ ہے کہ آج جو نظام وہ دنیا کو دے رہے ہیں اور چلا رہے ہیں اسمیں مغرب کی چار بڑی طاقتوں کی بالادستی قائم ہے۔ اقوام متحدہ کا فیصلہ کن ادارہ سلامتی کونسل ہے جس میں پانچ مستقل ارکان کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، پوری دنیا کے دو اڑھائی سو ممالک ایک طرف ہوں اور ان پانچ میں سے صرف ایک ملک بلکہ اس ملک کا ایک شخص جب چاہے پوری دنیا کے متفقہ فیصلہ کو مسترد کر دے۔ برطانیہ جو انتہائی چھوٹا سا ملک ہے اور پوری دنیا کا نقشہ سامنے ہو تو شاید وہ نظر بھی نہ آئے اس کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ساری دنیا کی متفقہ رائے کو کالعدم قرار دیدے۔ یہ کیوں؟ یہ اسلئے کہ مغرب میں جبلی طور پر اپنی بالاتری اور بالادستی کا تصور موجود ہے۔ مغرب کے

ڈھن، مزاج اور نفسیات میں یہ بیٹھا ہوا ہے کہ ہم دنیا کی تمام غیر گوری اقوام کیلئے معلم اخلاق اور مدرس تہذیب بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

دنیا کے مختلف اقوام میں فکری تعصّبات موجود ہیں :

ایک زمانہ تھا جب گورے انسان کی ذمہ داری یا وہائٹ مینز برڈن کی اصطلاح انہوں نے وضع کی تھی۔اس پر کتابیں لکھی گئیں اس پر فلسفے گھڑے گئے۔اس پر نظریات بنائے گئے کہ ہم دنیا کو اخلاق و کردار سکھانے پر مامور کئے گئے ہیں۔ہم دنیا کو مہذب بنانے کیلئے بھیجے گئے ہیں۔یہ مثالیں کوئی شکایت کے طور پر نہیں عرض کی جارہی ہیں بلکہ یہ واضح کرنے کیلئے عرض کی جارہی ہیں کہ دنیا کی مختلف اقوام میں فکری طور پر ایسے تعصّبات موجود ہیں جنہوں نے ان کے نظام اور تصورات کو بین الاقوامی اور بین الانسانی تصورات نہیں رہنے دیا۔اب ان کو اس ضرورت کا احساس ہونے لگا ہے۔

آج سے کئی سال پہلے ۱۹۹۳ میں امریکہ میں ایک پارلیمنٹ آف ورلڈ ریلیجز کا انعقاد کیا گیا جس میں دنیائے اسلام کے اہل علم کو بھی بلایا گیا۔اس طرح کی ایک پارلیمنٹ ۱۸۹۳ میں بھی منعقد کی گئی تھی جس میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے علماء بھی مدعو کئے گئے تھے، جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ 100 سال کے بعد دوسری پارلیمنٹ آف ورلڈ ریلیجز کا انعقاد کیا جائے گا جواب 1993 میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسانوں کی کثرت میں وحدت کیسے پیدا کی جائے اور وحدت قائم کرنے کے بعد اس کو کیسے اعتدال کی حدود میں رکھا جائے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنے کے بعد اور دنیا میں ایک نیا عالمی نظام دینے کے بعد بھی یہ ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے کہ وحدت میں کثرت کا علاج تلاش کیا جائے یعنی وحدت اور کثرت میں ایک اعتدال کیسے پیدا کیا جائے کہ وحدت کثرت پر اور کثرت وحدت پر اثر انداز نہ ہو۔اس طرح کی مساعی سے یہی امر واضح ہوتا ہے کہ دنیا کو ابھی تک ایسے بین الانسانی نظام کی تلاش ہے۔

3.....بین الاقوامی تعلقات کی اساس موجودہ دور میں حکومتوں، ملکوں اور افراد کے مفادات پر ہے۔عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ حکمران کے اپنے مفادات ہوتے ہیں اور عوام کے اپنے مفادات ہوتے ہیں جنکو مصالح کا نام دیا جاتا ہے۔اگر قانون سازی کا کام تمام تر انسانوں پر چھوڑ دیا جائے تو یہ بالکل ناممکن ہوگا کہ انسان اپنے مفادات سے بالاتر ہوکر ایک عادلانہ اور یکساں قانون دے سکے اس کا علاج صرف الٰہی قانون ہی ہوسکتا ہے۔علامہ اقبال کے الفاظ میں وحی حق ہی اسکا علاج ہے اسلئے کہ وحی حق بنیندہ سود ھمہ علامہ کا قول ہے کہ وحی حق ہی یکساں طور پر سب کا مفاد پیش نظر رکھ سکتی ہے اور یہ اجتماعی مفاد صرف اسلام کے حوالے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔سورۃ حدید کی ایک آیت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ رسالت کے سارے سلسلے کو اسلئے شروع کیا گیا ہے کہ لیقوم الناس بالقسط تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوجائیں۔آسمانی کتابیں اتارنے کا اور انبیاء کے بھیجنے کا مقصد اسکے علاوہ اور کچھ نہیں کہ انسانوں کے مابین عدل حقیقی قائم ہو۔اسلئے عدل کا قیام اسلام کے تمام قوانین کا بالعموم اور بین الاقوامی قوانین کا بالخصوص

بنیادی ستون اور طرہ امتیاز ہے۔

اسلام کا قانون پاسداری میثاق اور ایفائے عہد :

عدل وانصاف کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز جو اسلام میں بین الاقوامی تعلقات اور لین دین کی اساس رہی ہے وہ معاہدہ اور قول کی پابندی ہے پاسداری میثاق اور ایفائے عہد کو بین الاقوامی تعلقات کے باب میں ہمیشہ مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے ایفائے عہد کے بغیر کوئی دیرپا عادلانہ نظام قائم نہیں ہوسکتا کتاب قانون میں چاہے کچھ لکھا ہوا گر انسانوں کا مزاج ایفائے عہد کا نہیں ہے تو عدل وانصاف کا حصول ایک سراب ہے۔ اس ایفائے عہد کو یقینی بنانے کیلئے انسانوں کے مابین زبانی اور تحریری معاہدے ہوتے چلے آئے ہیں۔ دنیا کے قوانین اور دساتیر دراصل انہی معاہدوں کی ایک شکل ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقوام عالم کا ریکارڈ ان معاہدوں پر عمل درآمد کے باب میں کیا رہا ہے۔ صد افسوس کہ یہ ریکارڈ بڑا افسوس ناک ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ معاہدے کی سپرٹ کی مکمل پاسداری صرف مسلمانوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ جن کی مثالیں جمع کی جائیں تو جلدیں کی جلدیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کیا ایک طرف سے خود سپہ سالار اسلام امین الامت فیلڈ مارشل حضرت ابوعبیدؓ بنفس نفیس کمان کر رہے تھے دوسری طرف سے فاتح عالم حضرت خالد بن ولید تھے۔ خالد بن ولید اپنی سمت سے فاتحانہ داخل ہوئے اور ابوعبیدہ نے مصالحت سے کام لیا اور صلح کر کے دوسری سمت سے شہر میں داخل ہو گئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ دونوں سپہ سالار دو مختلف سمتوں سے داخل ہوتے ہیں اور دونوں کے گھوڑے شہر میں جس جگہ آ کر ملتے ہیں وہاں آ کر پتہ چلتا ہے کہ دوسرا سپہ سالار کس طرح شہر میں داخل ہوا ہے۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون کی دفعات پر منٹوں میں عمل درآمد ہو جاتا ہے۔ فوراً ایک لکیر کھینچ کر شہر کو دو حصہ میں تقسیم کر دیا گیا، اتفاقی امر یہ کہ شہر کا گرجا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا کہ لکیر اس کے درمیان سے گذرتی تھی۔ چنانچہ شہر کے ایک حصے پر جسے حضرت خالد بن ولید نے فتح کیا تھا اس پر فتح کے احکام کا نفاذ کیا گیا۔ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے ہاتھوں جو علاقہ فتح ہوا اس پر صلح کے احکام نافذ کئے گئے۔ اسکے نتیجے میں آدھا گرجا مسجد بنا دیا گیا اور باقی آدھا گرجا گرجا ہی رہنے دیا گیا۔ اور یوں شہر کے آدھے حصے پر اسلامی قانون کے احکام لاگو کئے گئے اور دسرے آدھے حصہ پر جو حضرت ابوعبیدہؓ کے ہاتھوں فتح ہوا تھا اس پر بدستور عیسائی احکام باقی رکھے گئے۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے جب مسلم احکام والا علاقہ زیادہ عدل ومساوات اور بھائی چارے کا مظہر بنا تو عیسائی رعایا بھی جلد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی اور اس کے پرزور مطالبے پر شہر کے باقی ماندہ حصہ پر بھی مسلم احکام نافذ کر دیئے گئے یہ احکام اس وقت تک لاگو نہیں کئے گئے جب تک کہ خود عیسائی آبادی نے اس کا مطالبہ نہیں کیا۔

اسطرح حضرت عمرؓ ہی کے عہد مبارک میں بنی تغلب جو ایک مشہور عیسائی قبیلہ تھا اس نے قبول اسلام سے انکار کیا اور جنگ ختم کرنے کیلئے یہ شرط رکھی کہ ہم اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی ماننے کیلئے تیار ہیں لیکن ہم جزیہ نہیں دیں گے۔ زکوۃ کی رقم ہم سے دوگنی وصول کی جاسکتی ہے لیکن جزیہ دینے کو ہم اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ شرائط قبول کر کے ان سے معاہدہ کر لیا جس میں ایک شرط یہ بھی رکھی

گئی کہ اگر ان کا کوئی بچہ مسلمان ہونا چاہے گا تو وہ اسے مسلمان ہونے سے نہیں روکیں گے۔ یہ معاہدہ تقریباً اڑھائی تین سو سال تک قائم رہا۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں، امویوں کے زمانہ میں اور منصور عباسی کے زمانہ میں حتی کہ معتصم کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً ایسے حالات پیدا ہوتے رہے کہ حکمرانوں نے اسے کالعدم کرنا چاہا لیکن مسلمان فقہاء وعلماء ہمیشہ بنی تغلب کے تحفظ کیلئے اور بنی تغلب کے مسیحیوں کے دفاع کیلئے کھڑے ہوگئے اور اس معاہدے کی بنیاد پر حکمرانوں سے ٹکر لی۔ انہوں نے حکمرانوں کو مجبور کیا کہ اس معاہدہ کو کالعدم نہ کریں۔

ایفاء عہد کی ایسی ایسی ہزاروں مثالیں اسلامی تاریخ کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں اس کیلئے مسلمانوں نے بہت سے فقہی قواعد بھی بیان کئے ہیں ان میں سے ایک قاعدہ ہے **المسلمون عند شروطهم** یہ حدیث کے الفاظ ہیں اور یہ اسلامی قانون کا ایک کلیہ ہے۔ یعنی مسلمان اپنی دی ہوئی شرائط کی سو فیصد پاسداری کریں گے اور جو شرائط طے کریں گے ان کی مکمل پابندی کریں گے صرف ایک استثناء کے ساتھ **الا شرطا احل حراما او حرم حلالا** سوائے ایسی شرط کے جس میں شریعت کی حلال کردہ کوئی چیز حرام قرار پائے یا شریعت کی حرام کردہ چیز حلال قرار پائے۔ بالفاظ دیگر کوئی ایسا معاہدہ جس کی رو سے مثلاً شراب حلال ہو جائے یا سود جائز قرار پائے درست نہ ہوگا۔ اس شرط کے علاوہ مسلمان جو شرط بھی طے کریں گے اسکی سو فیصد پابندی کی جائیگی۔

ایفائے عہد کے چند کلیات :

ایک اصول یہ طے کیا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی سفیر کسی بدعہدی کا ارتکاب کرے گا تو اس کا تاوان مسلمان ادا کریں گے مسلمانوں کے کسی ایک سپاہی کی بدعہدی کے نتیجے میں کسی کا کوئی نقصان ہو جائے تو اسکی ذمہ داری تمام مسلمان قبول کریں گے۔ اور اسلامی ریاست کا خزانہ اس نقصان کی تلافی کرے گا۔ اس سلسلہ میں اصول وضع کیا گیا' **غدر الرسول کغدر المرسل** " یہ کلیہ فقہاء اسلام نے مرتب کیا ہے جس کے معنی ہیں کہ ایلچی کی غداری اور بدعہدی ایلچی بھیجنے والے کی غداری کے مترادف ہوگی اور سفیر کی بدعہدی ریاست کی بدعہدی شمار ہوگی۔ اس سے فقہاء اسلام نے یہ کلیہ نکالا کہ وعدے کی پابندی اور معاہدے کی پاسداری پوری ذمہ داری سے کی جائیگی۔ اور بظاہر بھی کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے کہ جس سے اس معاہدی کی روح کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

یہی قبیلہ بنی تغلب جس کا ابھی ذکر کیا گیا اس نے یہ وتیرہ اختیار کیا ہوا تھا کہ رومیوں کو اکسا کر ان کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف وقتاً فوقتاً مخالفانہ کاروائیاں کرتا رہتا تھا۔ کبھی ڈاکے ڈالتا تھا کبھی مسلمانوں کی قریبی بستیوں پر چھاپے مارتا رہتا تھا۔ رومیوں کا یہ گروہ بنی تغلب کی مدد سے آتے جاتے مسلمان تاجروں کو بھی لوٹا کرتا تھا۔ ان کے غنڈے مسلمانوں کی خواتین کو تنگ کیا کرتے تھے لیکن معاہدہ اپنی جگہ موجود تھا۔ حضرت معاویہؓ ان سے گفت وشنید کر کے ان کے سرپرست رومیوں سے پرامن بقائے باہمی کا ایک معاہدہ کیا اور اس سابقہ معاہدہ کے تسلسل کے طور پر یہ طے کیا کہ اس پر عملدرآمد کیلئے اس کی مدت میں اضافہ کیا جائے گا۔ اور اگر کسی سال معاہدہ پر عمل درآمد کی مدت میں توسیع نہ کی گئی اور رومیوں کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی کی گئی تو مسلمانوں کو ملٹری ایکشن لینے کا اختیار ہوگا حضرت معاویہؓ نے فوجی لشکر تیار کیا اور یہ طے کیا کہ جس دن معاہدہ ختم ہوگا اس سے اگلے دن حملہ کر دیں گے۔ یہ ارادہ کر کے حضرت

معاویہؓ فوج لیکر روانہ ہو گئے۔ ابھی فوج لیکر شہر سے باہر نکلے ہی تھے کہ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد لشکر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اسکی سربراہی صحابی جلیل حضرت عمرو بن عبسہؓ کر رہے تھے۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے اس طرز عمل کو معاہدہ کی روح کے خلاف سمجھا اور اس طریقہ کار کی مخالفت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''وفاء لا غدر'' مسلمانوں کا طرہ امتیاز وفا ہے بدعہدی نہیں۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے ارادہ ملتوی کر دیا اور ملٹری ایکشن نہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا **ائتمن من ائتمنک و لا تخن من خانک** جو تمہارے ساتھ دیانت داری کرے تم اسکے ساتھ دیانت داری کرو اور جو تم سے خیانت کرے تم اس سے خیانت نہ کرو۔ یہ ہے وہ رویہ جو مسلمانوں کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ دشمن ایک سال تک امن کی زندگی گزرے تم اس کے بعد اسے نوٹس دو کہ معاہدہ ختم ہو گیا ہے۔ اب ہم ایکشن لینے کیلئے آزاد ہیں۔ آپ نے اس کو غافل کر کے تیاری شروع کر دی اور آپ نے اچانک فوج روانہ کر دی۔ اگرچہ یہ عملی طور پر معاہدے کی گو خلاف ورزی نہ تھی کہ ان پر حملہ نہ تھا' بلکہ صرف فوج کی روانگی ہی تھی۔ لیکن ایسا کرنا معاہدے کے اخلاقی پہلو کے منافی تھا۔ صحابہ کرامؓ نے اپنے سپہ سالار کو اس کی اجازت نہیں دی۔ یہ مثالیں صرف اسلام ہی کے بین الاقوامی قانون میں ملتی ہیں۔

اسلام کا قانون تالیف قلب :

اسلامی قانون کا ایک اور امتیازی وصف جسے قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے تالیف قلب ہے۔ اسلام نے خالص عبادات مثلاً زکوۃ میں بھی مولفۃ القلوب کا حصہ رکھا ہے۔ تالیف قلب کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی ریاست ایسے اقدام کرے جس سے غیر مسلم اسلام کے قریب آجائیں' تاکہ ایک نہ ایک دن وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں' یا کم از کم اسلام سے نفرت کرنا چھوڑ دیں۔ اور یوں اسلام کی روحانی سرحد وسیع سے وسیع تر ہو۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو مذہب خالص عبادات میں بھی یہ طرز عمل اپناتا ہے تو بین الاقوامی تعلقات میں اس کا کیا دائرہ کار اور طرز عمل ہوگا۔

6..... امن و امان اور تالیف قلب کی اس پالیسی کا ایک مظہر یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی ہمیشہ کوشش یہ رہی کہ میدان جنگ میں بھی دشمن کا کم از کم نقصان ہو پہلے کوشش کی جائے کہ تالیف قلب سے کام چل سکے اگر اس سے کام نہ چلے تو اسکی عسکری قوت کو کم کرنے پر اکتفا کیا جائے' اسکی جانی' مالی یا اقتصادی تباہی کے درپے نہ ہوا جائے۔ اگر اسکی عسکری قوت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ مسلمانوں سے شکست کھا جاتا ہے تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے مکمل تباہی کی اب اجازت نہیں دی جائیگی رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں غزوات میں جو جو اقدام کئے ان پر یکے بعد دیگرے غور کریں تو کم از کم جانی اتلاف کی کوشش ہر جنگ میں نظر آئے گی۔ بلکہ اکثر تو یہی کوشش کی جاتی تھی کہ بغیر جنگ کے ہی کام چل جائے دشمن کی جان کا کم از کم نقصان کیا جائے اور حتی الامکان غیر حربی اقدامات سے مقاصد حاصل کئے جائیں یہ پالیسی سیرت پاک کے سارے مدنی دور میں کارفرما نظر آتی ہے۔ ہجرت کے فوراً بعد سرکار دو عالم ﷺ نے مشرکین مکہ پر مختلف ذرائع سے معاشی دباؤ بڑھایا۔ اگرچہ معاشی دباؤ بڑھانے کے عمل اور پالیسی کے ساتھ ساتھ تالیف قلب کی پالیسی بھی جاری رہی۔

چنانچہ قحط کے دنوں میں اہل مکہ کیلئے غلہ اور سامان خوراک ہدیہ بھجوایا' جس پر مشرکین قریش چیخ اٹھے کہ محمد (ﷺ) ہمارے نوجوانوں کو

ہم سے برگشتہ کئے جاتے ہیں تاہم دشمن کے بااثر اور دولتمند قائدین کے خلاف معاشی دباؤ کا عمل بھی اپنی جگہ موجود رہا۔

دشمن کے دشمنوں سے دوستی کے معاہدے اور محالفے (Alliances) قائم کرنا بھی اسی ہدف کا ایک حصہ تھا کہ کم سے کم جانی نقصان سے مقاصد حاصل کئے جائیں۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا مدینہ کا دفاع ان چوطرفہ معاہدوں اور محالفوں سے مضبوط ہوتا گیا۔ قبیلہ مزینہ سے معاہدہ اسکی نمایاں مثال ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ مکہ کے قرب و جوار کے قبائل سے دوستی کے معاہدوں سے ذریعہ اہل مکہ کو یکتا وتنہا کیا گیا جس کے نتیجہ میں بلا کسی قابل ذکر عسکری کارروائی کے ۸ ھ میں مکہ فتح ہوگیا۔

یہ اسلامی قانون بین الممالک کے چند امتیازی خصائص واوصاف تھے۔ قانون سیر اور احکام مغازی پر غور کیا جائے تو بڑی آسانی سے ان مقاصد واہداف کا تعین بھی ہوجاتا ہے جو اسلام کے قانون بین الممالک کے پیش نظر رہنے چاہئیں' بالفاظ دیگر ایک اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی تعلقات کے مقاصد واہداف کیا ہونے چاہئیں۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ ان مقاصد کو بیان کیا جاتا ہے۔

﴿1﴾ اسلام میں قانون بین الممالک اور بین الاقوامی روابط کے اولین مقاصد تو وہی ہیں جو خود اسلامی شریعت کے مقاصد ہیں۔ شریعت کا اولین مقصد دنیا میں عدل وانصاف کا قیام ہے سورۃ حدید کی آیت 25 میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ نہ صرف شریعت محمدی بلکہ تمام شرائع سابقہ اور کتب سماویہ کا ایک ہی ہدف اور مقصود تھا اور وہ یہ کہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوجائیں عدل وانصاف اس تصور اور نظام کی بنیاد پر جو شریعت نے فراہم کیا ہے۔ عدل وانصاف کے اس ہدف کو حاصل کرنے میں جو جو وسائل اور ذرائع درکار ہوں وہ حاصل کرنے چاہئیں اور جس جس سے حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے تعاون کیا اور لیا جاسکتا ہو وہ کیا اور لیا جائے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی نوعمری میں ایک محالفہ (Alliance) میں شرکت فرمائی تھی جس کے بنیادی تاسیسی ارکان میں رسول اللہ ﷺ کے عم محترم جناب زبیر بن عبدالمطلب بھی شامل تھے۔ اس محالفہ میں طے کیا گیا تھا کہ اس کے ارکان غریبوں کی مدد کیا کریں گے' مسافروں کے حقوق کا تحفظ کریں گے' بے سہارا لوگوں کو سہارا دیں گے' مظلوم کی دادرسی کریں گے' مقروضوں کے قرضے ادا کرنے میں مدد دیں گے' بیواؤں اور یتیموں کی مشکلات کو ختم کریں گے۔ اس معاہدہ کا نام حلف الفضول تھا۔ اور یہ عرب کے متعدد قبائل نے مل کر کیا تھا۔

یہ معاہدہ جو حضرت عبداللہ بن جدعان (بعد میں ایک مشہور صحابی) کے مکان پر طے پایا تھا بین الاقوامی عدل وانصاف کیلئے تعاون کی ایک اعلی مثال پیش کرتا ہے۔ بعد میں ایک موقعہ پر جب صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے بہت ہی پسندیدگی کے ساتھ اسکا ذکر فرمایا۔ اور ارشاد ہوا کہ یہ معاہدہ تو مجھے سرخ اونٹوں (یعنی اعلی ترین مال ودولت) سے بھی بڑھ کر عزیز تھا اور پھر ارشاد فرمایا **ولو دعیت الیه فی الاسلام لاجبت** اگر اسلام میں مجھے کسی ایسے معاہدہ میں شرکت کیلئے بلایا جائے تو میں فوراً لبیک کہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے ہر قومی اور بین الاقوامی انتظام میں شریک ہونا جو اسلام کے اعلی وارفع اخلاقی مقاصد کی تکمیل کا خواہاں ہو عین سنت رسول ہے' اور ہر مسلمان کو آگے بڑھ کر اس کو لبیک کہنا چاہئے۔

﴿2﴾ حصول مقاصد:

اسلام کے قانون بین الممالک کا دوسرا بڑا ہدف قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان مقاصد شریعت کا حصول ہے جو دراصل شریعت کے جملہ

احکام کا اصل مطمح نظر ہیں۔یعنی تحفظ دین، تحفظ جان، تحفظ عقل، تحفظ نسل اور تحفظ مال۔اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم ہدف مسلمانوں کی جان و مال اور عقل و نسل کا بالخصوص اور دوسرے انسانوں کی جان و مال اور عقل و نسل کا بالعموم تحفظ ہے۔جیسا کہ معلوم ہے فقہائے اسلام نے ان پانچوں مقاصد کے تین درجات مقرر کئے ہیں جن کی روشنی میں ان مقاصد کیلئے کوئی پالیسی بناتے وقت بڑی سہولت سے ترجیحات وضع کی جاسکتی ہیں۔

﴿3﴾ تسہیل دعوت :

تیسرا بڑا ہدف تسہیل دعوت ہے جو دراصل اسی دوسرے ہدف کا ایک حصہ ہے اگر اسلامی ریاست فی الواقع کوئی نظری ریاست ہے تو اسکی تمام داخلی اور خارجی پالیسیوں کا ہدف نظریہ اسلام کی خدمت ہونا چاہئے۔جو ممالک اور اقوام نظریہ اسلام کی بابت دوستانہ یا کم از کم غیر مخالفانہ رویہ رکھتے ہوں ان کیلئے اسلامی ریاست کی پالیسی دوستانہ یا غیر مخالفانہ ہونی چاہئے۔اسی طرح جن ممالک و اقوام کا رویہ اسلام سے دشمنی اور عناد کا ہو ان سے دوستی کا معاملہ رکھنا تحفظ دین کے ہدف سے ہم آہنگ نہ ہوگا۔نظریاتی بنیادوں پر بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کا تعین تاریخ کے ہر دور میں نظریاتی ریاستوں کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ابھی ماضی قریب میں دنیا بھر میں کمیونسٹ ریاستوں کی تمام تر خارجہ پالیسیوں کا تعین نظریاتی بنیادوں پر ہی ہوا کرتا تھا آج بھی مغرب کی جمہوری ریاستیں جو آزادی رائے اور آزادی ضمیر کے نعروں کی علمبردار ہیں بلکہ ان میں سے بعض کی ساری کاوشوں کا حاصل بزور وقوت اپنے نظریات کا دوسروں کو خواہی نہ خواہی پابند بنانا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لہذا اگر اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کا ہدف دعوت اسلامی کی تسہیل اور نشر و اشاعت ہو تو اس پر کسی کو بلاوجہ چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہئے۔

تسہیل دعوت سے مراد بزور اسلامی دعوت کی اشاعت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد دعوت اسلامی کے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنا اور مناسب سہولتیں مہیا کرنا ہے۔پھر جن اقوام اور ممالک سے دوستانہ روابط ہوں ان روابط کو ان ممالک میں اسلامی دعوت کی اشاعت اور وہاں موجود دعوت کی مساعی میں آسانی پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا جائے۔اور اگر کسی قوم یا ملک سے جنگ یا دشمنی کے تعلقات کی نوبت آجائے تو یہ جنگ اور دشمنی کسی ذاتی نفرت، مادری مفاد، جوع الارض یا خواہش اقتدار کی وجہ سے نہ ہونی چاہئے بلکہ خالصتاً نظریہ اسلام کے مفاد میں ہونی چاہئے۔حتیٰ کہ عین حالت جنگ میں بھی مخالف فوج کیلئے نفرت کے نہیں ہمدردی کے احساسات ہونے چاہئے اور یہ دعا زبان پر رہنی چاہئے۔اے اللہ میری اس قوم کو ہدایت دے کہ یہ اصل بات سے ناواقف ہیں(**اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون**)

﴿4﴾ اعلاء کلمۃ اللہ:-

یعنی اللہ کے کلمہ یعنی پیغام اسلام کا اعزاز و وقار۔قرآن پاک کی سورۃ توبہ میں جہاں بہت سے احکام بین الاقوامی قانون کے بیان کئے گئے ہیں وہاں **لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا** ارشاد فرمایا گیا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ بین الاقوامی تعلقات اور لین دین سب اللہ کے دین کی خاطر ہو۔مقصد یہ ہو کہ اللہ کے رسول کی شریعت کا نام اونچا رہے اور اس کے نام لیواؤں کی سبکی نہ ہو۔اس بات کو یوں بھی

بیان کیا گیا ہے الاسلام یعلو و لایعلی علیہ اسلام دوسرے نظاموں سے بلند مرتبہ ہے کوئی اس سے بلند مرتبہ نہیں ہوسکتا۔ امام محمد بن الحسن الشیبانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''کتاب السیر الکبیر'' میں اس اصول کے انطباق کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔

﴿5﴾ امن وسلامتی کا قیام :

دارالاسلام کے اندر خصوصا اور دنیا بھر میں عموما اسلام کے قانون بین الممالک کا پانچواں ہدف ہے۔ قرآن پاک نے سورۃ انفال میں صاف حکم دیا ہے کہ جوں ہی فریق مخالف امن وسلامتی کا طرز عمل اختیار کرے تم بھی فورا یہی رویہ اختیار کر کے اللہ کا نام لیکر جنگ بند کردو' یہاں تک کہ اگر دشمن دوستی کی پیشکش کو دھوکہ اور وقتی پالیسی کے طور پر بھی اپنائے تب بھی اللہ کے بھروسہ پر اس کا مثبت جواب دو۔ بین الاقوامی لین دین اور بالخصوص محاربانہ تعلقات میں یہ اہتمام رکھنا کہ حتی الامکان امن وسلامتی اور انسانی جان کے احترام کا اصول ہاتھ سے نہ جائے سیرت کے واقعات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے رسول اللہ ﷺ کو بیسوں جنگوں میں خود شرکت فرمانے اور بہت سے دستے (طلائع، طلایا اور سرایا) بھیجنے کا اتفاق ہوا۔ ان فوجی مہمات کے نتیجہ میں نو سال سے کم عرصہ میں دس لاکھ مربع میل علاقہ فتح ہوا' کم وبیش تین سو پونے تین سو میل روزانہ کے حساب سے رقبہ اسلامی ریاست کی حدود میں داخل ہوا۔ لیکن اس ساری کامیابی میں ماہانہ دو کے حساب سے دشمن کے آدمی کام آئے۔ مسلمانوں میں شہادت کا اوسط اس سے بھی کم تھا۔ اتنی کم جانی قربانی سے اتنی بھرپور' دیرپا اور ہمہ جہت کامیابی کی مثال پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے۔

﴿6﴾ اسلامی ریاست کا استحکام :

بین الاقوامی قانون کا چھٹا مقصد اسلامی ریاست کا استحکام ہے۔ یہ مقصد بین الاقوامی تعلقات کے ذریعہ بھی حاصل کیا جاتا ہے اور بین الاقوامی قانون کے مختلف احکام پر عملدرآمد کے ذریعہ بھی۔ لیکن ریاست کے استحکام اور ریاستی مصالح کی خاطر عدل وانصاف اور مقاصد شریعت کو نظر انداز کر ڈالنے کی اسلام میں اجازت نہیں۔

﴿7﴾ مسلم اقلیتوں کا تحفظ :

بین الاقوامی قانون اور تعلقات کا ساتواں مقصد مسلم اقلیتوں کا تحفظ ہے' لیکن شریعت اور بین الاقوامی معاہدات کی حدود کے اندر رہ کر' جیسا کہ حضرت ابوالبصیرؓ اور ابو جندلؓ کے واقعات بسلسلہ صلح حدیبیہ سے واضح ہوتا ہے۔ خود قرآن مجید میں سورۃ انفال میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ اگر دارالحرب کے مسلمان تم سے کسی دینی معاملہ میں مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا فرض ہے، ماسوائے اس صورت کے کہ تمہارے اور اس ملک کے درمیان کوئی معاہدہ ہو جہاں کے مسلمانوں نے مدد طلب کی ہے۔ ایسی صورت میں معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے وہاں کی مسلم اقلیت کی مدد نہیں کی جاسکتی۔

یہ ہیں وہ بنیادی مقاصد واہداف جو اسلام میں بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی تعلقات کے ذریعہ حاصل کئے جاتے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین۔